تعلیم و تربیت

مئی
2010

چچّا تیز گام
شادی میں گئے

سبق نمبر 57

Shezan
Twist
MANGO
BANANA
Shezan
Twist
STRAWBERRY
2 New
Flavors

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

مئی 2010ء

70 واں سال پہلا شمارہ

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
حمد	ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی	2
درسِ قرآن و حدیث	سید مقبول حسین شاہ	3
تعلیم و تربیت	ضیاء الحسن ضیاء	4
گواہی	کلیم چغتائی	5
میرے پسندیدہ اشعار	باذوق قارئین	9
مفید مشغلے	غلام حسین میمن	11
سچ کی آواز	محمد فاروق دانش	13
چاند گاڑی	وقار محسن	17
آپ بھی لکھئے	ہونہار ادیب	19
کہانی کاغذ کی	رانا محمد شاہد	22
خوشبو سب کے لئے	ذیشان بن صفدر	25
بچوں کا انسائیکلو پیڈیا	ڈاکٹر طارق ریاض خان	28
اُمید بہار رکھ	ماہ رو سید	32
جنگل سے جنگل تک	محمد عارف عثمان	37
داؤدی علمی آزمائش	ذہین قارئین	42
بندگی	علی اکمل تصور	43
کام کریں بس کام۔۔۔	وسیم عالم	46
آپ کا خط ملا	ننھے قارئین	48
ایک عدالت ایسی۔۔۔!	نذیر انبالوی	51
محسن	فہیم عالم	55
چچا تیز گام	ذیشان قریشی	57
ہونہار مصور	ننھے مصور	63
بلا عنوان	ننھے خوشہ چیں	64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے۔

سرورق: "چچا تیز گام"

قیمت فی پرچہ 25 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کے محبوب رسالے "تعلیم و تربیت" نے اپنی اشاعت کے 69 سال مکمل کر لیے ہیں۔ اس خوشیوں بھرے موقع پر ہماری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔ آپ کے ہاتھوں میں جو شمارہ ہے یہ 70ویں سال کا پہلا شمارہ ہے۔ جب سے "تعلیم و تربیت" کا اجراء کیا گیا ہے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ بچوں کے لیے ایسی تحریریں شائع کی جائیں جس سے تفریح کے ساتھ ساتھ بچوں کی کردار سازی بھی ہو۔ "تعلیم و تربیت" سے مستفید ہونے والے بے شمار بچے اِس وقت مختلف شعبوں میں وطنِ عزیز کی تعمیر و ترقی کے لئے اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔ "تعلیم و تربیت" بلاشبہ اس وقت بچوں کا سب سے محبوب اور پسندیدہ رسالہ ہے۔ دُعا کیجئے کہ "تعلیم و تربیت" بچوں کی کردار سازی اور ذہنی تربیت کے لئے اسی طرح شائع ہوتا رہے۔

چچا تیز گام سیریز کی پہلی کہانی "چچا تیز گام شادی میں گئے" شاملِ اشاعت ہے۔ یہ کہانی آپ کو کیسی لگی، ضرور بتایئے گا۔ ہاں، ایک اور نئے سلسلے "واقعہ کچھ یوں ہے!" کا آغاز جلد کیا جائے گا۔ آپ اس سلسلے کے لئے کوئی دل چسپ اور سبق آموز واقعہ بھیج سکتے ہیں۔ آپ جس کتاب سے واقعہ لیں اُس کا حوالہ دینا مت بھولیئے گا۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجئے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر خاص	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سید مقبول حسین شاہ	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔

مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔

ایشیاء، افریکا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور

UAN: 042 - 111 62 62 62 Fax: 042 - 6278816

Email: tot.tarbiatfs@gmail.com

tot.tarbiatfs@live.com

حمد

اِس دُنیا کی ہر اک شے کو بنانے والا ایک اللہ
گاؤں شہروں اور ملکوں کو بسانے والا ایک اللہ

دَریاؤں ، نہروں کا جال بچھانے والا ایک اللہ
اور اُن سے کھیتوں کی پیاس بجھانے والا ایک اللہ

گلشن کا ہر بوٹا اُس کا ، لالہ اس کا گیندا اُس کا
کیاری کیاری ، روش روش مہکانے والا ایک اللہ

جنگل اُس کے ، جنگل میں سب بسنے والے جانور اُس کے
ہاتھی ، چیونٹی ، شیر ، اُڑیال بنانے والا ایک اللہ

دَریا اور سمندر اُس کے ، موتی اُس کے ، مونگے اُس کے
تیرنا پانی میں مچھلی کو سکھانے والا ایک اللہ

پتھر میں جو بند ہے کیڑا ، کوئی نہیں وسیلہ جس کا
وقت پہ اُس کو بھی روزی پہنچانے والا ایک اللہ

سب کا آقا ، سب کا مولا ، سب کا والی ، سب کا داتا
عابدؔ ، سب کے بگڑے کام بنانے والا ایک اللہ

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی، لاہور

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایسی بات کہہ دیتا ہے جو دُوسرے کو بُری لگتی ہے اور اُس بات پر اُسے غصہ آتا ہے۔ اُسے اپنے اوپر قابو نہیں رہتا اور وہ اُس سے بھی سخت باتیں کہہ دیتا ہے جس سے بات بڑھتی ہے اور نوبت دشمنی تک جا پہنچتی ہے۔ اگر صبر و تحمل سے کام لیا جائے اور دُوسرے سے نرمی سے اور سمجھانے کے انداز میں بات کی جائے تو جھگڑے کی نوبت نہیں آتی اور دُوسرے کا رویہ بھی مصالحانہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ نے اِس بات کو پسند نہیں کیا کہ ذرا ذرا سی بات پر انسان لڑنے جھگڑنے لگ جائے۔ لوگ بھی ایسے شخص کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اِس سلسلے میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ہمیں بہترین راہنمائی ملتی ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

سورۂ شوریٰ آیات ۳۶۔۳۷: "اللہ کے ہاں (آخرت میں) جو کچھ ہے بہتر ہے اور باقی رہنے والا (اُن) ایمان لانے والوں کے لئے جو اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں اور جو لوگ کہ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔"

صحیح حدیث میں ہے: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے فرمایا: "ایک دُوسرے سے بغض نہ رکھو، کسی سے حسد نہ کرو اور نہ آپس میں بول چال بند کرو اور سب اللہ کے بندے ایک دُوسرے کے بھائی بن کر زندگی گزارو اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلقات یا بول چال ترک کرے۔"

(صحیح بخاری کتاب ۷۸۔ باب ۵۷: صحیح مسلم کتاب البر۔ باب ۷)

بعض دفعہ چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہونے سے بات اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ کوئی بھی دُوسرے کو معاف کرنے یا صلح کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنی غلطیوں اور زیادتیوں کا احساس کرتا ہے۔ صرف دُوسرے کی زیادتیاں ذہن پر مسلط ہوتی ہیں اور اُن کے بارے میں سوچ کر ہر وقت سڑنے کڑھنے سے صحت خراب ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں صلح کے لئے پیش قدمی کرنا چونکہ مشکل کام ہے اِس لئے صلح کے لئے پہل کرنے والے شخص کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُس کا بڑا نصیب ہے۔

سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۴۔۳۵: میں ہے کہ جو "بُرائی کے جواب میں بھلائی کرتے ہیں وہ دیکھیں گے کہ دشمنی دوستی میں بدل جائے گی اور یہ چیز اُن کو حاصل ہوتی ہے جن کا بڑا نصیب ہے۔"

جس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرما دے کہ اُس کا بڑا نصیب ہے، بلاشبہ جنت میں اُس کا اعلیٰ مقام ہو گا اور اُس کے سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ دُوسرے کو معاف کرنا اور صلح کرنا اتنا مشکل کام نہیں جتنا بڑا اِس کا انعام ہے۔ ہر شخص کی کوشش ہونی چاہیے کہ جھگڑے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان کا فائدہ اٹھائے اور دُوسرے کو معاف کرنے اور منانے میں پہل کرے تاکہ اللہ تعالیٰ اُس سے خوش ہو اور جنت میں اُس کو اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

اچھا انسان وہ ہے جو اپنی خامیوں اور دُوسروں کی اچھائیوں پر نظر رکھے۔ اس طرح دُوسروں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف کرنے میں اُسے آسانی ہو گی اور اُس کی عزت میں اضافہ ہو گا۔

پیارے بچو! آیئے عہد کریں کہ ہم ایک اچھے انسان بن کر زندگی بسر کریں گے اور دُوسروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کرنے میں پہل کریں گے تاکہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو اور وہ ہمیں دُنیا اور آخرت کی نعمتوں سے سرفراز کرے۔ آمین۔

تعلیم و تربیت

بچوں کا اعتبار ہے تعلیم و تربیت
کس درجہ پُر بہار ہے تعلیم و تربیت

ستر برس سے جاری ہے یہ آن بان سے
واقف ہیں سارے چھوٹے بڑے اس کی شان سے
اِس کو عزیز رکھتے ہیں سب اپنی جان سے
چاہت ، خلوص ، پیار ہے تعلیم و تربیت
بچوں کا اعتبار ہے تعلیم و تربیت
کس درجہ پُر بہار ہے تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت نے سنواری ہے زندگی
تعلیم و تربیت سے ملی سب کو روشنی
تعلیم و تربیت نے ہی بخشی ہے آگہی
یوں وجہِ افتخار ہے تعلیم و تربیت
بچوں کا اعتبار ہے تعلیم و تربیت
کس درجہ پُر بہار ہے تعلیم و تربیت

مالک ہوں یا مدیر ہوں یا اس کے کارکن
اِس کو نکھارنے کی بہرحال سب کو دُھن
پڑھتا ہے اس کو جو بھی وہ گاتا ہے اس کے گُن
دلچسپ و شان دار ہے تعلیم و تربیت
بچوں کا اعتبار ہے تعلیم و تربیت
کس درجہ پُر بہار ہے تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت کا سفر کامیاب ہے
تعلیم و تربیت ہی ہمارا نصاب ہے
اِس پر کرم خدا کا ضیاؔ بے حساب ہے
ہر دل کا یہ قرار ہے تعلیم و تربیت
بچوں کا اعتبار ہے تعلیم و تربیت
کس درجہ پُر بہار ہے تعلیم و تربیت

ضیاء الحسن ضیاء، کراچی

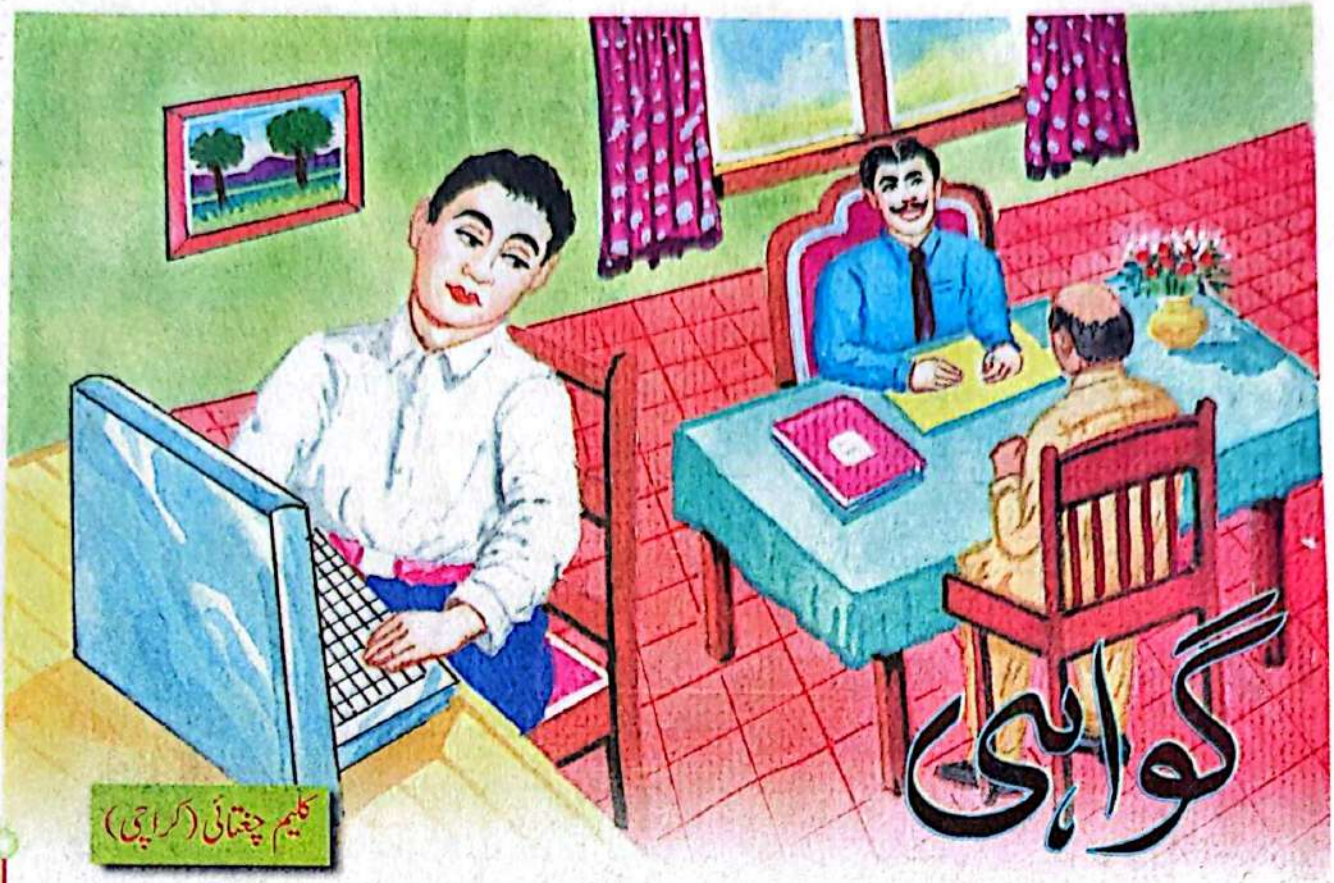

گواہی

کلیم چغتائی (کراچی)

باوردی چوکیدار نے سیلوٹ مارا اور کارخانے کا گیٹ کھول دیا۔ سیٹھ رفیق کی بڑی سی کار تیزی سے کارخانے میں داخل ہو گئی۔

سیٹھ صاحب کی کار، پارکنگ کے علاقے میں اپنی مخصوص جگہ پر جا کر رک گئی۔ ڈرائیور نے اُتر کر جلدی سے کار کا دروازہ کھولا۔ سیٹھ صاحب کار سے اترے، دُوسری طرف سے سیٹھ صاحب کا پندرہ سالہ لڑکا صدیق بھی دروازہ کھول کر اتر گیا۔ صدیق کے اسکول میں آج کل چھٹیاں تھیں۔ سیٹھ رفیق نے اُسے حکم دیا تھا کہ جب تک چھٹیاں ہیں، وہ روزانہ فیکٹری آیا کرے اور یہاں انتظامی امور انجام دینا سیکھے۔

سیٹھ صاحب اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں جو بھی مزدور یا ملازم انہیں ملتا، وہ انہیں سلام کرتا، لیکن پتا نہیں کیوں صدیق نے محسوس کیا کہ زیادہ تر لوگ سیٹھ صاحب سے خوش نہیں تھے۔ وہ سیٹھ صاحب کو دیکھ کر تو خوشامد بھرے انداز میں سلام کرتے مگر ایک دوبار صدیق نے آگے بڑھنے کے بعد بعد مڑ کر دیکھا تو وہ لوگ سیٹھ صاحب کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

سیٹھ صاحب اپنے کمرے تک جاتے ہوئے موبائل فون پر گفتگو کرتے رہے۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے گھنٹی بجائی اور ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا، پھر انہوں نے، منیجر کو طلب کر لیا اور اس سے مختلف امور پر بحث میں مصروف ہو گئے۔ اچانک انہوں نے چونک کر صدیق سے کہا۔

"بیٹے! تم اُدھر والی میز سنبھال لو جس پر کمپیوٹر رکھا ہے، آج تو تم کمپیوٹر سے کھیلو، کل تمہیں کوئی کام دیں گے۔"

صدیق جا کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے والد اور منیجر صاحب کی آوازیں کبھی کبھی اسے سنائی دے جاتی تھیں۔ صدیق نے کمپیوٹر چلا دیا اور کارخانے کے بارے میں تازہ ترین رپورٹ دیکھنے لگا۔ سیٹھ رفیق کے بڑے سے کارخانے میں کپڑا بنتا تھا۔ اس میں تین سو مزدور کام کرتے تھے جن کی اکثریت ڈیلی ویجز (روزانہ اُجرت) پر ملازم تھی یعنی انہیں روز کے روز اجرت دی جاتی تھی۔ مستقل ملازمین کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔

"مگر اُس کی ہمت کیسے ہوئی؟"

سیٹھ صاحب کی آواز صدیق کے کانوں سے ٹکرائی اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ مینجر صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے تھے اور سیٹھ صاحب ان پر گرج رہے تھے۔ غصے میں اُن کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

"یہ تین آدمی فساد کی جڑ ہیں۔ ایک ہارون، دُوسرا صدیقی اور تیسرا جمیل..... ان تینوں کو فیکٹری سے دھکے دے کر نکال دو۔"

"مگر سر، اِس طرح تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ یہ لوگ ویسے بھی مستقل ملازمین ہیں۔"

"او..... ہو!" سیٹھ صاحب نے دانت پیسے۔ "میں بھی ان کا مستقل علاج کردوں گا۔ سنو، پرسوں گودام والی سائیڈ میں آگ لگا دو۔ سارا قیمتی سامان وہاں سے ہٹا لینا۔ صرف فالتو چیزیں چھوڑ دینا۔ ویسے بھی انشورنس تو ہو چکی ہے۔ ہم انشورنس والوں سے کہہ دیں گے کہ ہماری قیمتی مشینیں اور بہت سے تھان جل گئے ہیں اور ان تینوں بدمعاشوں ہارون، صدیقی اور جمیل کے خلاف پرچہ کٹوا دینا کہ انہوں نے آگ لگائی ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔" مینجر صاحب آہستہ سے بولے۔

"اور سنو! آٹھ دس مزدوروں کو پکڑ لینا، گواہی دینے کے لیے، مل جائیں گے نا؟"

"یس سر، کیوں نہیں، ہزار ہزار روپے دینا پڑیں گے۔"

"کوئی بات نہیں، دے دینا، اب آپ جائیں۔"

مینجر صاحب سلام کر کے رخصت ہو گئے لیکن صدیق کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پتھر کا ہو گیا ہو۔ اُس کی نظروں کے سامنے کمپیوٹر کا مانیٹر جیسے تھرتھرا رہا تھا، اس پر ہند سے ناچ رہے تھے۔ اُس کے سامنے میز، دیوار، دروازہ غرض یہ کہ پورا کمرہ گھوم رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹے! طبیعت ٹھیک ہے؟" صدیق کے والد پوچھ رہے تھے۔

"اس نے بہ مشکل سر اٹھا کر اپنے والد کی طرف دیکھا، اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اُس نے لرزتی آواز میں اتنا کہا۔

"ابو جی! میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

سیٹھ صاحب نے فوراً ڈرائیور کو بلوایا اور صدیق کو اسپتال بھیج دیا۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے صدیق کو تیز بخار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ صدیق کو بخار کس وجہ سے ہوا۔ دو تین سنئیر ڈاکٹروں نے اتنا کہا کہ کوئی اِسے ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ ڈاکٹروں نے صدیق کو نیند لانے والی دوا کا انجکشن دے کر سلا دیا۔ سیٹھ صاحب اسپتال آ کر چلے گئے تھے۔ صدیق کی والدہ اور ایک بہن بھی اسپتال پہنچ چکی تھیں۔

صدیق نیند کے انجکشن کے اثر سے چھے گھنٹے تک سوتا رہا۔ جیسے ہی اُس کی آنکھ کھلی، وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ قریب بیٹھی اُس کی امی بے تاب ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹا؟"

"ہاں! ٹھیک ہے امی۔ میرا موبائل کہاں ہے؟" اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"تمہارا موبائل؟ وہ تو شاید فیکٹری میں رہ گیا ہو گا، لو تم میرا موبائل لے لو۔"

اس کی امی نے اپنا موبائل فون اُسے دے دیا۔

صدیق نے جلدی جلدی اپنے عزیز دوست رضوان کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔ رضوان گھر پر ہی تھا۔ صدیق نے اُسے فوراً اسپتال پہنچنے کے لیے کہا۔ رضوان، صدیق کا گہرا دوست تھا۔ ہر خوشی ہر غم میں اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

رضوان تھوڑی دیر بعد اسپتال پہنچ گیا۔ وہ حیران تھا کہ صدیق کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔

رضوان کے آنے پر صدیق کی امی کمرے سے نکل گئیں تاکہ دونوں دوست آزادی سے باتیں کر سکیں۔ یوں بھی وہ گئی گھنٹے تک بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھیں۔

"رضوان! میری مدد کرو، بہت خطرناک معاملہ ہے۔"

"ہوا کیا؟" رضوان حیرت سے بولا۔

"صدیق نے اُسے جلدی جلدی صورتِ حال سے آگاہ کیا

اور بولا۔

"تم کسی طرح یہ بھیانک سازش رکوادو۔"

"مگر یہ سوچ لو کہ اس طرح تمہارے ابو کے خلاف بھی کارروائی ہو سکتی ہے۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔"

رضوان اسپتال سے نکل کر سیدھا اپنے ماموں کے پاس گیا جو خفیہ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ اُن کے ذریعے سے اُس نے خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ سے ملاقات کی۔ افسر اعلیٰ مہتاب صاحب نے رضوان کی بات توجہ سے سنی، پھر بولے۔

"کیا آپ اس اطلاع کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہیں؟"

"جی ہاں جناب، یہ بھی تو دیکھیے کہ فیکٹری کے مالک کا بیٹا خود یہ اطلاع دے رہا ہے۔"

"کیا وہ وقت پڑنے پر گواہی دے گا؟"

"بالکل جناب، مگر خدا کے لیے جلدی کریں، ہمارے پاس کل ہی کا دن ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں، ان شاء اللہ اب کچھ نہیں ہو گا، مجھے آپ جیسے بچوں پر فخر ہے، آپ اپنا فون نمبر اور پتا وغیرہ لکھواتے جائیں۔"

----☆☆----

سیٹھ صاحب رات گیارہ بجے ہی نیند کی گولیاں کھا کر سو گئے تھے۔ اُن کی آنکھ کھلی تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ انہوں نے گھنٹی بجا کر ملازم سے اخبار منگوایا۔ اخبار آ گیا تو انہوں نے خوشی خوشی اخبار پر نظر دوڑائی۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی فیکٹری میں آگ لگنے کی خبر نمایاں طور پر چھپی ہوئی ہو گی۔ مگر یہ کیا؟ اخبار کے پہلے صفحے پر خبر تھی کہ رفیق ٹیکسٹائل

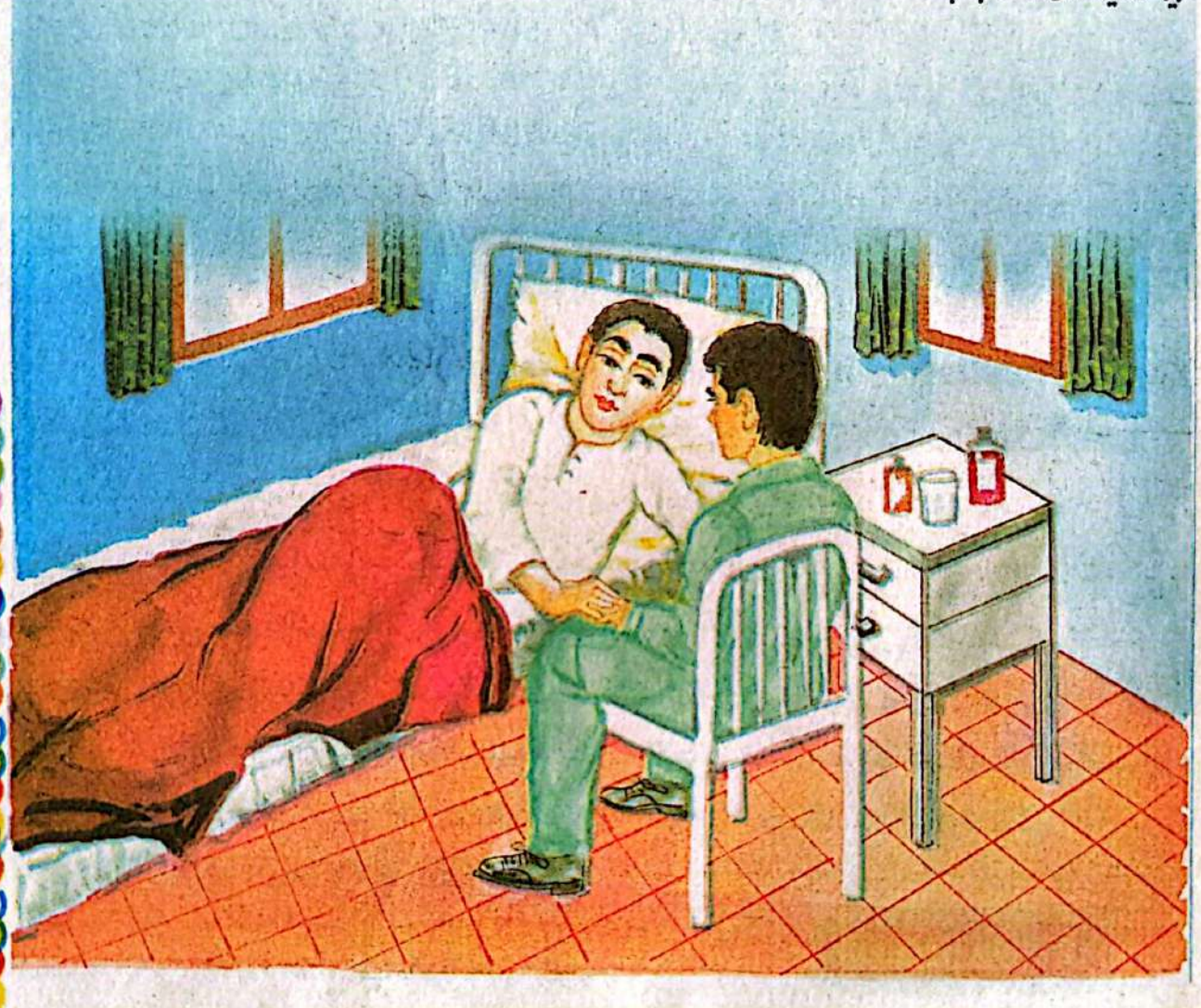

مل میں آگ لگانے کی کوشش ناکام بنادی گئی۔ خفیہ پولیس کے اہلکاروں نے جو کل ہی مزدور بن کر فیکٹری میں بھرتی ہوئے تھے، تین مزدوروں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اُن سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ ان مزدوروں کی اطلاع پر مینجر کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ سیٹھ صاحب کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنا موبائل فون اٹھایا اور ایک ٹریولنگ ایجنسی کو فون کر کے ملک سے باہر جانے والی پہلی پرواز میں نشست بک کروانے کی ہدایت کی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ سیٹھ صاحب اچھل پڑے۔

"کون ہے؟"

انہوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا۔

"صاحب! پولیس نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے!" نوکر کی آواز آئی۔

یہ سن کر سیٹھ صاحب اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔

---☆☆---

صدیق سر جھکائے اخبار پڑھ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اخبار میں عدالتی کارروائی کی پوری تفصیل چھپی ہوئی تھی۔ سیٹھ صاحب کے علاوہ خود اس کی اور مینجر صاحب کی تصاویر بھی تھیں۔ گورنر صاحب نے اُسے خراج تحسین پیش کیا تھا۔ عدالت میں مزدوروں نے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔ صدیق کو بھی گواہی دینے کے لے طلب کیا گیا تھا۔ سیٹھ صاحب کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔ انہیں جیل بھیج دیا گیا تھا۔

صدیق نے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو پونچھے۔ اُس کے کانوں میں مسجد کے امام صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔ پچھلے جمعے ہی کی تو بات ہے، امام صاحب نے قرآن مجید کی سورۃ النساء پڑھ کر درس دیا تھا، وہ یہی تو کہہ رہے تھے:

"اے ایمان والو انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لیے سچی گواہی دو، خواہ اس میں تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہو۔"

---☆☆---

دُنیا کی مثال

دُنیا کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص جنگل کی طرف جاتا ہے اُس نے دیکھا کہ اُس کے پیچھے شیر آرہا ہے۔ وہ بھاگا، جب تھک گیا تو دیکھا کہ سامنے ایک گڑھا ہے۔ اُس نے چاہا کہ گڑھے میں چھلانگ لگا کر جان بچائے لیکن گڑھے میں ایک خوف ناک سانپ نظر آتا ہے، اب آگے اژدھا اور پیچھے شیر کا خوف۔ اتنے میں ایک درخت کی شاخ نظر آئی۔ وہ درخت پر چڑھ گیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ درخت کی جڑ کو کالا چوہا کاٹ رہا ہے۔ وہ بہت خائف ہوا کہ تھوڑی دیر میں درخت کی جڑ کٹ گئی تو گر پڑوں گا پھر اُسے شیر کا لقمہ بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ اتفاق سے اُسے ایک شہد کا چھتہ نظر آیا۔ وہ اِس شہد کو پینے میں اتنا مشغول ہوا کہ نہ ڈر رہا سانپ کا اور نہ شیر کا۔ اتنے میں درخت کی جڑ کٹ گئی اور وہ نیچے گر پڑا۔ شیر نے اُسے چیر پھاڑ کر گڑھے میں گرا دیا اور وہ اژدھے کی خوراک بن گیا۔ یہاں جنگل سے مراد یہ دُنیا۔ شیر سے مراد موت ہے جو انسان کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ گڑھا قبر ہے، چوہا دِن اور رات ہیں۔ درخت عمر ہے۔ شہد دنیائے فانی سے غافل کر دینے والی لذت ہے۔ انسان دُنیا کی لذت میں مشغول ہو کر اپنے اعمالِ بد بھول جاتا ہے اور پھر اچانک موت آجاتی ہے۔

(محمد طاہر وسیم، گجرات)

میرے پسندیدہ اشعار

آپ کے پسندیدہ اشعار پر مبنی "تعلیم و تربیت" کا نیا دل چسپ سلسلہ

زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں
(عادل محمود، گجرات)

زیست ہمسائے کا مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا
(نازش توقیر، موگلہ)

زخم بھر جاتا ہے پتھر کا، اگر ہو جسم پر
قلب پر جو زخم لگتا ہے کبھی بھرتا نہیں
(سلمیٰ صفی، ٹمن)

سودا جہاں سے ہائے کوئی کچھ نہ لے گیا
جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لئے
(ہارون الرشید، جہلم)

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا
(حفصہ کوثر، میاں چنوں)

وہی عظیم ہیں اے دوست اس زمانے میں
شکست کھا کے جو ہمت جوان رکھتے ہیں
(فرخ حیات، پیر محل)

سحر کی شرط نہیں، شامِ غم کی قید نہیں
یہاں جو ڈوب کے اُبھرے وہی ستارہ ہے
(عاقب روانہ، کوٹ مومن)

سنگِ گراں ہیں راہ میں لاکھوں تو کیا ہوا
منزل چھپی ہوئی تو میرے حوصلوں میں ہے
(عروہ یونس، لاہور)

سمجھو وہاں پھل دار شجر کوئی نہیں ہے
وہ صحن کہ جس میں کوئی پتھر نہیں گرتا
(دامن زہرا، اسلام آباد)

نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون
(کائنات فاطمہ، گجرات)

نگاہِ دہر میں ذرے سہی، مگر ہم لوگ
ضیاء کی بھیک نہیں مانگتے ستاروں سے
(محمد شہباز اعجاز، ڈیرہ غازی خان)

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سر عام رکھ دیا
(عروج احسان، کوہاٹ)

انہیں پتھروں پہ چل کے اگر آسکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے
(تاشف احمد، لاہور)

رہا کچھ آسرا رستے میں منزل پر پہنچنے کا
نظر آتی رہی جب تک کہ گردِ کارواں مجھ کو
(سارہ جاوید چوہدری، وہاڑی)

روز کھا لیتے ہیں ہنستے ہوئے چہروں سے فریب
کیا کریں اپنی نگاہوں میں مروت ہے ابھی
(محمد حسن سرفراز، راول پنڈی)

وہیں سے زندگی کی درحقیقت راہ ملتی ہے
سفینہ غرق ہو جائے جہاں ٹکرا کے ساحل سے
(سید احمد حسن، فیصل آباد)

رستے میں دوستوں کے بچا کے وفا کے پھول
ہم نے خود اپنی راہ میں کانٹے بچھا لیے
(نوید حسین، لاہور)

رنگِ محفل چاہتا ہے اِک مکمل انقلاب
چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں
(حامد نسیم، ایبٹ آباد)

راستے کے جس دیئے کو ہم سمجھتے تھے حقیر
وہ دیا گھر تک پہنچنے کا بہانہ بن گیا
(حاشر احمد، کراچی)

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا
(تاج محمد، ڈیرہ غازی خان)

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں کے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے، یہاں ابھی آئے، ابھی چلے
(عامر خان، جھنگ)

اللہ اللہ مدینے کی زمیں کا رتبہ
عرش سے فرش نشینوں کو سلام آتا ہے
(اقراء کائنات، کراچی)

اُسی کو حق ہے فضائے چمن میں رہنے کا
جو اپنے خون سے آرائشِ بہار کرے
(عاقب جاوید، کوہاٹ)

بارے دُنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو تم کہ بہت یاد رہو
(ملک ہاشم ضیاء، گجرات)

بات کا گھاؤ ہے ناسور، جو رستا ہے سدا
ورنہ ہر زخم تو کچھ دیر میں بھر جاتا ہے
(عبداللہ اشرف، گوجرانوالہ)

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
(رضوانہ اسلم، لاہور)

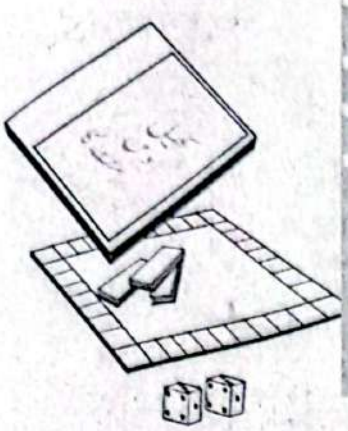

کھیل دس منٹ کا

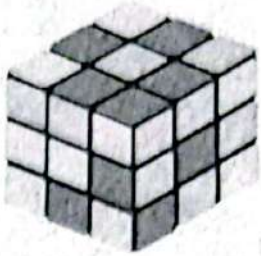

ا	ت	ی	چ	ذ	ط	ع	م	ل	د
ن	م	ک	ر	ت	و	ب	ک	ش	ن
غ	ص	س	ا	ٹ	و	ط	ط	و	ط
ٹ	ظ	ل	و	ر	ی	ش	ز	آ	پ
ع	ن	ا	ل	ق	ف	ذ	ع	ب	چ
ا	و	ک	ٹ	ر	ے	و	ن	ش	ٹ
د	ف	ا	ع	چ	م	ا	ی	ڑ	چ
ل	و	م	ڑ	ی	ر	ط	ع	ر	ط
ا	ی	ف	ر	و	م	و	ر	م	س
ت	س	گ	ی	ل	ت	ت	د	ا	و

آپ نے حروف ملا کر دس جانوروں اور پرندوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان جانوروں اور پرندوں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں اور اُوپر سے نیچے تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن جانوروں اور پرندوں کو آپ نے تلاش کرنا ہے ان کے نام یہ ہیں۔

شیر۔ چیتا۔ لومڑی۔ اونٹ۔ کبوتر۔ طوطا۔ چڑیا۔ مور۔ تتلی۔ کوا

آج ہم آپ کو ماچسیں جمع کرنے کے بارے میں بتائیں گے۔ گھروں میں چولہا جلانے کے لیے استعمال ہونے والی یہ چھوٹی سی ڈبیا، جس میں تقریباً 50 کے قریب دیا سلائی ہوتی ہیں، اُسے خالی حالت میں محفوظ رکھ کر آپ ایک نیا مشغلہ اپنا سکتے ہیں۔ اس مشغلے کو اختیار کر کے اس سے کیا فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں، اس سے قبل ہم آپ کو ماچس کی اولین ضرورت اور ایجاد کے بارے میں بتائیں گے۔

کہتے ہیں کہ انسان نے تقریباً 12 ہزار قبل مسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بحیثیت نبی آمد سے تقریباً 12 ہزار سال پہلے) آگ دریافت کر لی تھی۔ ابتداء میں لوگ آگ سے صرف اندھیرے میں دیکھنے کا کام لیتے تھے مگر پھر انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ کچا گوشت آگ پر رکھ کر پکایا جائے تو اس کی لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں آگ پیدا کرنے کے لیے پتھروں کو آپس میں رگڑا جاتا تھا۔

اب سے تقریباً تین سو سال پہلے آگ جلانے کا ایک آسان طریقہ دریافت ہوا۔ کیمیا دانوں نے تجربہ کیا کہ اگر پوٹاشیم کلوریٹ اور شکر کے محلول پر تھوڑا سا گندھک کا تیزاب ڈال دیں تو اچانک شعلہ سا بھڑک اٹھتا ہے۔ اسی طرح گندھک لگی تیلیوں کو سلفیورک ایسڈ میں ڈبو کر پوٹاشیم کلوریٹ اور شکر کے محلول سے آگ لگا کر جلانے کا آسان طریقہ وجود میں آیا۔ اس طرح دُنیا پہلی بار دیا سلائی سے متعارف ہوئی۔

اسی دوران انگلستان کے ایک کیمسٹ نے ریگ مال پر رگڑ کر آگ پیدا کرنے کا ایک اور آسان طریقہ دریافت کیا۔ اس کے بعد اس میں مزید سہولت پیدا کی گئی اور تیلیوں کے سرے پر فاسفورس لگایا جانے لگا جس کے بعد ریگ مال کی ضرورت ختم ہو گئی مگر یہ تیلی ذرا سی رگڑ پر جل اٹھتی تھی۔ تیلی اگر پاؤں کے نیچے دب جاتی تو شعلہ سا بھڑک اٹھتا تھا۔ یوں گھروں میں آگ لگنے جیسے واقعات بھی رونما ہونے لگے۔ بعدازاں اسے لوگوں نے قتل اور خودکشی کے لیے بھی استعمال کیا۔

1844ء وہ سال ہے جس میں پہلی بار سوئیڈن میں دُنیا کی پہلی محفوظ دیا سلائی ایجاد ہوئی۔ دیا سلائیوں کو ڈبیا میں رکھنے کا رواج پہلی جنگ عظیم کے بعد کا ہے۔ اس طرح

انسان نے اس ڈبیا کو بھی خوب صورت بنانے کا سوچا جو اس کے جمع کرنے جیسے مشغلے کا سبب بنی۔

ماچسیں جمع کرنے کے دو طریقے ہیں۔ یا تو مکمل خالی ماچس محفوظ کر لی جائے یا صرف اس کا لیبل۔ یہ تقریباً ایک صدی پرانا مشغلہ ہے۔ ماچس کی ڈبیا کا لیبل ڈاک ٹکٹوں کی طرح ہی ڈبیا سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے، مگر اس کے لیے پانی کا گرم ہونا ضروری ہے۔ ماچس کو اس گرم پانی میں ڈال دیں۔ کچھ دیر بعد لیبل علیحدہ ہو جائے گا اور پھر اسے کسی البم میں باآسانی جمع کر لیں۔

دُنیا میں ماچس کا سب سے پرانا لیبل جان واکر والی ماچس کا ہے۔ ماچسوں کے شائقین کے پاس موجود سب سے پرانا لیبل سموئیل جولنس کا ہے جو 1830ء کا ہے۔ ماچسوں کے سب سے زیادہ ذخیرے کے حوالے سے جاپان کے تیچی یوشی زاوا نے شہرت پائی۔ اُس نے بیس سال کی عمر میں یہ مشغلہ اپنایا تھا۔ اس کے پاس ساڑھے پانچ لاکھ سے زائد ماچسیں تھیں جو مجموعی طور پر سو ممالک سے تعلق رکھتی تھیں۔

آپ اپنے شوق کی تکمیل ماچسوں یا لیبل کو موضوعات میں تقسیم کر کے کر سکتے ہیں یا پھر پھول اور موٹر کاروں کو علیحدہ علیحدہ رکھ کر۔ کچھ ممالک کی ماچسوں پر پرندوں اور جانوروں کی تصاویر بھی ہوتی ہیں اور سائز بھی مختلف ہوتا ہے۔ تو پھر آپ بھی اس مشغلے کا آغاز کر رہے ہیں نا۔ ☆☆

قائداعظمؒ کے مشغلے

قائداعظمؒ کو بچپن ہی سے گولیاں کھیلنے اور مٹی کے ساتھ کھیلے جانے والے کھیلوں سے نفرت تھی کیوں کہ آپ شروع ہی سے صفائی پسند تھے۔ آپ کو بچپن میں پتنگ بازی کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ پتنگ اُڑا رہے تھے کہ کسی شریر لڑکے نے نیچے سے ڈور کاٹ دی۔ آپ کو اس کی خبر نہ ہوئی اور اس طرح پتنگ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس واقعہ سے آپ نے یہ سبق سیکھا کہ جب آنکھیں آسمان کی طرف ہوں تو پھر زمین سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

آپ کرکٹ کا کھیل بہت پسند کرتے تھے حتیٰ کہ آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانے لگے تو اپنے ایک دوست کو اپنا بلا اور گیند دیتے ہوئے کہا۔

"جب تک میں ملک سے باہر رہوں تم محلے کے لڑکوں کو کرکٹ کھیلنے کے لیے ہر شام میدان میں لے جایا کرنا اور جو نئے لڑکے ہوں انھیں اس کھیل کی تربیت دینا کہ وہ دُوسرے گندے کھیلوں سے بچے رہیں۔"

شیخ عبدالحمید عابد (گوجرانوالہ)

سچ کی آواز

محمد فاروق دانش (حیدر آباد)

"کہاں مر گیا فیدے۔" اُس کے نام کی آواز زور سے لگی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔ وہ ابھی چونکا نہیں تھا۔

"اوفیدے! برتنوں پر جلدی جلدی ہاتھ چلا۔ ابھی گاہک آتے ہی ہوں گے۔"

وہ ہلکے ہلکے برتنوں پر ہاتھ پھیرنے میں مصروف تھا۔ ایسے میں اس کے ابا کو جب اندازہ ہوا کہ اندر سے کام کی آواز نہیں آرہی تو وہ چلایا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ فہد کام کرتے کرتے جانے کن خیالات میں گم ہو جاتا ہے اور پھر کام سے اس کو رہائی مل جاتی ہے۔ ایسے میں اس کے ابے کا غصہ قابلِ دید ہوتا تھا۔ غصے کے باعث اسے مار بھی پڑتی تھی اور کام بھی زیادہ کرنا پڑتا تھا۔

اپنے باپ کی آواز نے اس کے ہاتھوں کی حرکت کو بڑھا دیا اور وہ تیزی سے برتن دھونے میں مصروف ہو گیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کام کرنے پر مجبور تھا۔ اس کا ابا ایک ہوٹل کا مالک تھا۔ پورے علاقہ میں اس کے "البیلا ہوٹل" کی دھوم تھی۔ اس ہوٹل کا ذائقہ عوام میں اتنا مقبول تھا کہ لوگ دُور دُور سے یہاں آتے تھے اور یہاں کے کھانوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس کا ابا خالص کاروباری ذہن کا آدمی تھا۔ وہ ہر انداز سے پیسہ کمانے اور اپنی رقم بچانے کا فن جانتا تھا۔

فہد کو اس نے اسکول میں داخل تو کرایا تھا۔ اُس نے پانچ جماعتیں بھی پاس کر لیں لیکن جب اُس نے اسکول جانے میں حیل وحجت سے کام لینے اور کھیل کود کی طرف دھیان دینا شروع کیا تو اس کے باپ نے اسے اسکول سے اٹھا کر اپنے ہوٹل پر بٹھانے کو ترجیح دی۔ اس کا کہنا تھا کہ آج کے دور میں پڑھائی میں کچھ نہیں رکھا۔ انسان کو روزی روٹی تو اپنی محنت کی کمائی سے ملتی ہے اس لیے بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹائیں۔ وہ اپنے بچوں کو کہتا تھا کہ یہ جما جمایا ہوٹل آخر کو ان کا ہے تو انہیں اس کام کو شروع دن سے ہی سنبھالنا چاہیے تاکہ بعد میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

فہد کا چھوٹا بھائی مجید اسی ہوٹل پر کام کرتا تھا۔ اُسے شروع دن سے ہی اسکول سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اور یہ بات اس کے باپ کے لیے کسی خوش خبری سے کم نہیں تھی۔ مجید کا رجحان کھانے پکانے کی جانب زیادہ تھا اس لیے اس کے باپ نے اسے اپنے کاری گروں کے ساتھ لگا دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ سالنوں کی تیاری کے کام میں معاونت کرتا تھا جب کہ فہد کے ذمہ اوپر کے کام تھے۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ جس طرح اس نے مختلف ہوٹلوں پر ڈش واشنگ، میزوں کی صفائی، ہوٹل کی دُھلائی اور کھانا پکانے کے تمام امور کی بہ تدریج ٹریننگ حاصل کی تھی اسی طرح فہد اور مجید کو بھی سارے چھوٹے موٹے کام سیکھنے چاہیں، اس کے بعد وہ انہیں کاؤنٹر پر

مالک کی صورت میں بٹھائے گا۔

مجید تو اپنے کاموں کو بہت خوشی کے ساتھ انجام دے رہا تھا لیکن فہد کو برتن دھوتے، ہوٹل میں جھاڑو لگاتے، پیاز کاٹتے ہوئے بے حد چڑ سی لگتی تھی، مگر وہ اپنے باپ کے سخت اصولوں سے مجبور تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں مصروف رہتا تھا کہ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ وہ اسکول جاتا رہتا تو نہ تو اُسے یہ کام کرنا پڑتا اور نہ ہی دن رات والد کی جھڑکیاں سننا پڑتیں۔ اب کیا کہیے! قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ وہ اپنی تقدیر پر راضی تھا، لیکن اندر ہی اندر گھلتا بھی رہتا تھا۔

فہد شرارتی تو دیگر بچوں کی طرح تھا لیکن اس کے اندر ایک عادت یہ تھی کہ وہ کسی بھی غلط کام یا غلط بات کو نظر انداز نہیں پاتا تھا بل کہ غلطی کرنے والے کو ٹوکنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کوئی برائی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ فوری اس کا تدارک چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سچ کی آواز بلند ہو۔

البیلا ہوٹل خاصا مصروف رہتا تھا۔ یہاں کا کھانا دیگر سستے ہوٹلوں کے مقابلے میں مہنگا تھا اس کے باوجود وہاں رش رہتا تھا اور یہاں کی سیل سے تمام ملازمین کو اجرتیں اور دیگر اخراجات نکالنے کے بعد بھی اس کے ابا کو خاصا منافع ہوتا تھا۔ وہ اس مال کو خوب خوب جوڑتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے منافع میں جس قدر اضافہ ہوتا جاتا تھا، اس کا رونا بھی اسی قدر بڑھتا جاتا تھا۔ گھر پر جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا تو کبھی گیس کا بل زیادہ آنے پر افسوس کرتا تو کبھی آٹا مہنگا ملنے پر اظہارِ شکایت کرتا۔

"اری نیک بخت! فریج بھی لے لیں گے، ذرا منافع تو ہو جانے دو۔"

اس نے اپنی بیوی کی فرمائش کے جواب میں کہا۔

"تمہیں کیا معلوم کہ ملازمین کی تنخواہیں نکالنا کس قدر دُشوار ہو چلا ہے۔" اس نے اپنی پیشانی پر بلا کی شکنیں لاتے ہوئے کہا۔

"ان دنوں مہنگائی نے کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔" اُس نے نہایت پریشان کن لہجے میں کہا۔ اس کی بیوی یہ بات سن کر چپکی سی ہو رہی۔

"اللہ ہمارے بھی دن پھیرے گا۔" اُس نے چہرے پر اداسی لاتے ہوئے کہا۔

"ابا! کبھی تو اللہ کا شکر ادا کیا کر، اتنی اچھی آمدنی ہے تیری۔"

فہد بھلا کب چپ رہنے والا تھا۔ وہ تو ہوٹل کی آمدنی سے خوب واقف تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بھلا کب چپ رہنے والا تھا۔

"ابے تُو چپ کر! تیری عادت نہیں جائے گی درمیان میں بولنے کی۔"

اس کے باپ نے غصہ سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ وہ کی اس ادا پر سہم گیا۔ ماں نے آنکھ کے اشارے سے اُسے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں رہا تو وہ ہاتھ چلانے میں بھی دیر نہیں کرے گا۔ اس کی ماں نے اسے سودا لانے کا کہہ کر گھر سے باہر بھیج دیا لیکن اسے راستے بھر یہ بات کھلتی رہی کہ اس کا باپ نوٹوں کی گڈیاں جیب میں بھرتا ہے اور اس کے باوجود روزی نہ ہونے کا بہانہ کرتا ہے۔ اسے اس ناشکری پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔

ابھی اس کے غصہ کے آثار ختم نہیں ہوتے تھے کہ اس نے ہوٹل کے معاملات میں نئی باتیں دیکھنا شروع کیں۔ ایک طرف تو اس کا باپ چیزیں مہنگی ہونے کا جواز بنا کر لوگوں سے پیسے زیادہ بٹورنے سے باز نہیں آرہا تھا تو دُوسری جانب اس کے باپ نے مہنگی ہونے والی چیزوں کے سستے متبادل ڈھونڈنا شروع کر دیے۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرتا رہے۔ فہد نے دیکھا کہ ان کے ہاں کھانے پکانے کے لیے جو کوکنگ آئل پہلے آتا تھا وہ بہتر ہوتا تھا لیکن اب ان کے ہوٹل میں جو تیل لایا گیا وہ انتہائی ناقص اور مضر صحت تھا۔

فہد نے تیل کے بیوپاری اور اپنے ابا کی باتیں سن لی

تھیں۔ بیوپاری کا کہنا تھا کہ تیل میں بو تو ہے لیکن اسے لہسن میں جلا کر استعمال کر لیا جائے گا تو کسی کو بھی بو کا پتا نہیں چلے گا۔ یوں اس تیل کا سودا اس نے عام تیل کے مقابلے میں آدھے ریٹ پر کر لیا۔ اس نے جب دو ایک بار کھانا پکوایا تو کسی گاہک کی طرف سے کوئی شکایت نہیں آئی۔ ان کے ذائقوں میں ہر خراب چیز بھی اچھی ہو جاتی تھی۔ اب تو اس کے باپ نے اس تیل کا منوں کے حساب سے سودا کر لیا اور گاہکوں کو اسی میں کھانا کھلانے لگا۔ فہد نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ابا سے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو اس نے ہاتھ جڑ دیا۔

"ابے نالائق! ابھی تو ٹانگ برابر ہوا نہیں ہے، اور مشورے دے رہا ہے ہمیں۔" وہ سخت طیش میں تھا۔ "اب تُو نے کوئی ایسی بات کی تو ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا۔" اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

وہ بھلا کیا اور اس کی بساط کیا، اس نے اپنی ماں سے اپنے باپ کی حرکت کا تذکرہ ضرور کیا لیکن وہ بھی اسے کے آگے کچھ نہ بول سکی۔ اگلے مرحلے میں جب گوشت مہنگا ہونے لگا تو پھر اس کا بھی حل انہوں نے سستے اور مضر صحت گوشت کی خریداری سے نکالا۔ ایسا ایسا خراب گوشت لایا جانے لگا کہ عام آدمی اس کو لا کر کھانے کا تصور نہ کرے لیکن وہ خراب گوشت کو گوشت گلانے کے پاؤڈر اور دیگر ذرائع سے قابلِ استعمال بنا لیتے اور کھانے کی خوشبو اور ذائقہ کسی بھی خرابی کا پتا چلنے نہیں دیتے تھے۔

فہد اپنے باپ کے بڑھتے ہوئے لالچ سے پریشان رہنے لگا۔ اس نے دو چار بار اپنے والد کو ٹوکا بھی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ مضر صحت اشیا کھلا کر لوگوں کی جانوں سے کھیل رہا ہے۔ وہ اس معاملے پر سنجیدگی سے کئی بار سوچتا رہ جاتا کہ وہ آخر کرے تو کیا کرے لیکن کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک ٹیم ان کے ہوٹل کے معائنے کے لیے آئی تھی۔ اس کا ابا پریشان تو ہوا لیکن کچھ ہی دیر بعد اس عملے کا افسر تو ایک جانب کھڑا ہو گیا اور اس کے اہل کار ابا کو ایک طرف لے جا کر بات چیت کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کے درمیان ہنسی کا تبادلہ ہونے لگا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ان کے درمیان کوئی "ڈیل" ہو چکی ہے۔

پھر اس نے دیکھا کہ ابا نے ہوٹل کے اندرونی حصہ میں موجود اپنی چھوٹی سی الماری کا تالا کھول کر اس میں سے سو سو کے چند کرارے لال نوٹ نکال کر اس اہل کار کی طرف

بڑھائے تھے، نوٹ دیکھ کر اور ان کی خوشبو سونگھ کر اہل کار کے لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ ہوٹل سے نکل کر باہر اپنے افسر کی جانب آیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گرین سگنل دیا۔ وہ افسر بھی خوش ہو گیا اور وہ خاموشی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ اب انہیں اپنے اگلے شکار کی جانب جانا تھا۔

فہد ہوٹل کے دروازے پر کھڑا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ اس امر پر رنجیدہ تھا کہ اس دور میں بُرا کام کرنا، لوگوں کی جان سے کھیلنا، انہیں تکلیف میں مبتلا کرنا، چوری ڈاکے ڈالنا کتنا آسان ہو چکا ہے۔ جرم کرنے والا آسانی سے جرم کر لیتا ہے اور اس کی باز پرس کرنے والے افراد اپنا حصہ لے کر اسے بڑی آسانی سے چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے گویا ایمان داری اور دیانت داری کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔ پھر اسے اور چھوٹ مل جاتی ہے۔ دُوسروں کا حصہ نکالنے کے لیے وہ مزید بے ایمانی کرے، مزید ملاوٹ کرے، مزید دھوکا دے۔ اب اس سے کوئی باز پرس کرنے نہیں آئے گا۔ ایک طوفان سا اس کے دل ودماغ میں اٹھتا رہا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ اچانک فہد دوڑ کر اس گاڑی کے سامنے آگیا۔

"ٹھہریے صاحب! آپ ایسے ہی نہ جا سکتے۔"

اس کے انداز پر افسر پریشان ہو گیا۔ اہل کار نے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ افسر نے اتر کر حال احوال لینے میں عافیت جانی۔

"اس ہوٹل میں مضر کھانا تیار کیا جاتا ہے۔" وہ چلا کر بولا۔ "حفظانِ صحت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھا جاتا ہے اور آپ اتنی آسانی سے اسے کلیر کر کے نہیں جا سکتے۔"

اس کا باپ شور سن کر باہر آگیا۔ اس نے جب فہد کی کارروائی دیکھی تو وہ اس کے پیچھے دوڑا۔

"ابے باپ کی شکایت لگاتا ہے۔ نکمے! حرام خور!" یہ کہہ کر وہ اُسے مارنے لگا۔

"آپ اس ہوٹل سے کھانے کے سیمپل لیے بغیر نہیں جا سکتے۔" وہ پٹتا رہا اور سچ بولتا رہا۔ "اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو میں آپ کی رشوت خوری کی شکایت آگے کروں گا۔" اس کا باپ اسے مار مار کر ہوٹل کے اندر لے جا رہا تھا اور وہ اپنے ضمیر کی آواز پر اپنے ہی باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہا تھا۔ ☆☆

چھوٹی سی برائی

نوشیرواں عادل ایک مشہور بادشاہ تھا۔ ایک دن وہ اپنے درباریوں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔ جب شکار کیا ہوا گوشت پکانے کا وقت آیا تو باورچی کو پتہ چلا کہ وہ نمک لانا بھول گیا ہے۔ اُس نے ایک غلام کو آواز دی اور کہا۔

"ذرا دوڑ کر قریبی گاؤں سے تھوڑا سا نمک لے آؤ۔" بادشاہ نے باورچی کی بات سن لی۔ اُس نے غلام کو بلا کر کہا۔

"بغیر دام دیئے نمک ہرگز مت لانا۔"

غلام نے ادب سے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "جہاں پناہ! آپ بادشاہ ہیں اگر آپ کے لیے تھوڑا سا نمک مفت لے آؤں تو کیا حرج ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔

"شروع میں ہر برائی چھوٹی معلوم ہوتی ہے مگر وہ بڑھتے بڑھتے اتنی بڑی ہو جاتی ہے کہ اس کو ختم کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اگر بادشاہ چھوٹی برائی کرے تو لوگ اُس کو دیکھ کر بڑی برائی کرنے لگتے ہیں۔ اگر بادشاہ کسی درخت سے ایک سیب مفت لے لے تو رعایا اُس درخت کے سب سیب بغیر قیمت ادا کیے چٹ کر جائیں گے۔"

(عثمان ارشد، فیصل آباد)

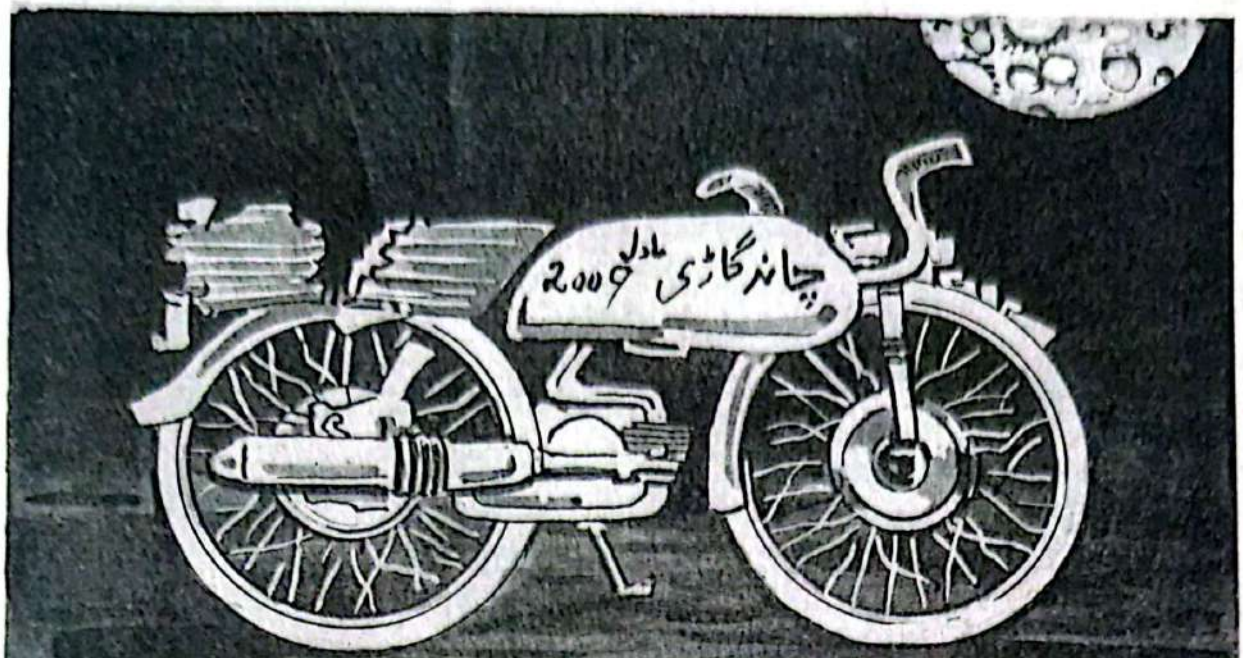

چاند گاڑی

وقار محسن (کراچی)

عنوان پڑھ کر چونکئے نہیں، ہم آپ کو قطعی کسی خلائی مشین سے متعارف نہیں کرا رہے ہیں۔ دراصل ہوا یوں کہ ہم لانڈھی کالونی میں تقریباً بیس سال سے رہائش پذیر تھے اور لانڈھی سے ایمپریس مارکیٹ تک بسوں کے پائے دانوں پر لٹکتے لٹکتے تنگ آگئے تھے۔ اس کے علاوہ منی بسوں میں حالتِ رکوع میں کھڑے کھڑے کچھ چال ایسی ہو گئی تھی جیسے سڑک پر کچھ تلاش کرتے ہوئے چل رہے ہیں۔ دفتر دیر سے پہنچنے پر اکثر ہیڈ کلرک شیخ مبارک علی صاحب کی جھاڑ پڑتی۔ دفتر پہنچنے پر ہم لوگوں کو قسم کھا کر یقین دلاتے کہ گلے میں لٹکتے جس کمر بند کو دیکھ کر وہ ہنس رہے ہیں بس میں سوار ہونے سے پہلے وہ ٹائی ہوا کرتی تھی۔

اس کے علاوہ ہماری بیگم برسوں سے اصرار کر رہی تھیں کہ اگر چار پہیوں والی نہیں تو کم سے کم دو پہیوں والی اپنی ذاتی سواری کا بندوبست کر لیں۔ اب مبلغ چار ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ میں تو سائیکل کے لیے بھی گنجائش نکالنا مشکل تھی۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں ہمارے دوست رفیق جاگرانی کہنے لگے کہ وہ سیکنڈ ہینڈ کار خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اپنی خاندانی موٹر سائیکل ہنڈا ففٹی فروخت کرنا چاہتے ہیں جب ہم نے ڈرتے ڈرتے ان سے مطلوبہ قیمت معلوم کی تو مسکرا کر کہنے لگے۔

"تم سے کیا سودا کرنا صرف دو ہزار دے دینا۔"

اب ہمارے لئے دو ہزار کا بندوبست کرنا بھی مشکل مرحلہ تھا۔ بیگم سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک ہزار کی کمیٹی ڈالی ہے جو تین ماہ بعد ملے گی لیکن وہ کوشش کریں گی کہ کچھ پہلے مل جائے۔ شام کو جب بیگم نے بتایا کہ ایک ہزار روپیہ کا بندوبست ہو گیا ہے تو ہمیں اپنا خواب پورا ہوتا نظر آیا۔ اب باقی ایک ہزار کا مسئلہ تھا جو ہم نے اخباروں کی ردی اور کچھ کباڑ فروخت کر کے حاصل کئے اور جب ہم دو ہزار کی خطیر رقم لے کر قبلہ جاگرانی کے دولت خانے پر پہنچے تو انہوں نے مسرت سے ہمیں گلے لگاتے ہوئے گیلری میں کھڑی موٹر سائیکل کے پنجر سے

ہمارا تعارف کرایا جس کی پیٹرول کی ٹنکی پر کسی اناڑی پینٹر نے جلی حروف میں ''چاند گاڑی ماڈل 2007ء'' لکھا ہوا تھا۔ ہمارے افسردہ چہرہ کو دیکھ کر جاگرانی صاحب نے تسلی دی۔

''صرف سروس کی ضرورت ہے۔ پچھلے بائیس سال سے ہماری پوری فیملی اس پر سفر کر رہی ہے۔ پیٹرول تو بس صرف سونگھتی ہے بس صبح کے وقت تھوڑا سا دھکا لگوانا پڑتا ہے۔''

قصہ مختصر یہ کہ جب ہم موٹر سائیکل کے اس پنجر کو گدھے گاڑی پر لاد کر اپنے گھر پہنچے تو گھر والوں اور پڑوسیوں نے گھیر لیا۔ چاروں طرف سے تبصرے شروع ہو گئے۔

''بھیا جی! یہ خود بھی چلتی ہے یا ہمیشہ گدھا گاڑی رکھنا پڑے گی۔''

''وقار صاحب! آپ دیکھ لیں جب بھی آپ سڑک پر نکلے تو اقدام خودکشی میں دھر لئے جائیں گے۔''

''وقار میاں! باہر مت کھڑی کرنا کے ایم سی کی کچرے کی گاڑی اٹھا کر لے جائے گی۔''

ہمیں معلوم تھا کہ لوگ حسد میں اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ اتوار کی صبح کو ہم نے چاند گاڑی کی صفائی کا بیڑا اٹھایا۔ ایک گیلن مٹی کا تیل رگڑنے کے بعد جو مختلف رنگوں کی تہیں نظر آئیں اس سے اندازہ ہوا کہ مختلف اوقات میں نیلا، کالا، سرخ رنگ ویلڈنگ کے جوڑ چھپانے کے لئے کیا گیا تھا۔ پیٹرول کی ٹنکی کی صفائی کے دوران ٹافیوں کے ریپر، آم کی گٹھلی اور ایک ربڑ کی گیند برآمد ہوئی۔

اگلے دن جب ہم نے چاندگاڑی دفتر جانے کے لئے اپنے گھر کے سامنے کھڑی کی تو اہلِ محلّہ جمع ہو گئے اور ہمیں قابلِ رحم نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک بزرگ آگے بڑھے اور ڈبڈبائی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولے۔

''اچھا میاں! خدا حافظ، کہا سنا معاف کرنا۔''

دُوسرے صاحب بولے۔ ''آپ نے مجھ سے جو چالیس روپے ادھار لئے تھے وہ کس سے لوں اگر خدانخواستہ آپ.....''

تیسرا پڑوسی بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں بچوں کا ہم خیال رکھیں گے۔''

ایک صاحب مجمع کو چیرتے ہوئے آگے آئے اور اطلاع دی۔

''کورنگی نمبر ڈھائی میں ہم نے ''آب حیات'' کے نام سے نیا کلینک کھولا ہے ہڈیوں کی مرمت کے علاوہ پوسٹ مارٹم کا بھی بندوبست ہے۔ یہ لیں ہمارا تعارفی بروشر۔

وقتِ رخصت آ پہنچا۔ ہم نے فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے کک لگائی تو ہلکی سی سسکی کی آواز بھری۔ دُوسری کک پر کتے کی غراہٹ جیسی آواز آئی۔ تیسری بھرپور کک پر سائیلنسر کی جالی تڑاخ سے نکل کر پیچھے کھڑے حاجی رمضان علی کی ٹانگ پر لگی اور وہ ''ہائے'' کہہ کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ چوتھی کک پر انجن گھر گھرایا۔ پھر چاند گاڑی بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے روانہ ہوئی۔ برابر سے گزرتے ہوئے سائیکل سوار بھی ہم سے آگے نکل گئے۔ گاڑیوں میں بچے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

جب ہم ایمپریس مارکیٹ پہنچے تو سوا نو بجے تھے اور ابھی ہمیں بولٹن مارکیٹ تک کا سفر طے کرنا تھا۔ ظاہر ہے اگر ہم چاند گاڑی پر سفر جاری رکھتے تو دس بجے سے پہلے دفتر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے چاند گاڑی بریانی والے کی دُکان کے آگے کھڑی کی اور برابر سے گزرتی ہوئی بس کے پائے دان پر لٹک گئے۔ دروازے کا ہینڈل تو ہاتھ نہیں آیا اس لئے ہم نے آگے کھڑے ہم سفر کی گردن دبوچ لی۔ اُس نے جن الفاظ میں ہماری خاطر کی وہ ہم بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم جب منزلِ مقصود پر پہنچے تو گھڑی دس بجا رہی تھی اور ہم ہیڈ کلرک شیخ مبارک علی کی غضب ناک جھڑکیوں کا تصور کرتے ہوئے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

---☆☆---

کردار

(عمیر احمد، سرگودھا)

دودھ والے کی دُکان پر گاہکوں کا خاصا رش تھا۔ لالہ جی گاہکوں میں مصروف تھے کہ بارہ تیرہ سالہ عثمان بھی ایک چھوٹی سی بالٹی ہاتھ میں لئے وہاں پہنچا۔

"لالہ جی! آدھا کلو دودھ دے دیں۔" عثمان بولا۔

لالہ جی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی وہ کافی دیر

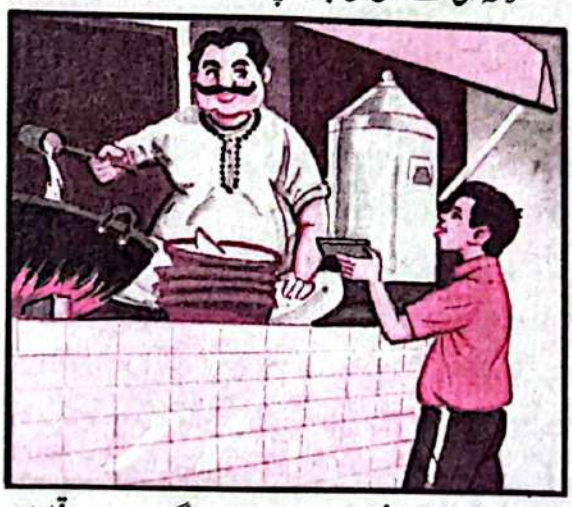

تک دودھ لینے کی کوشش میں مصروف رہا مگر اس سے قبل کہ وہ اپنی بالٹی آگے بڑھاتا دُوسرا کوئی گاہک اپنا برتن تیزی سے لال جی کو تھما دیتا۔ لالہ جی کی دُکان پر یوں تو ہر وقت رش رہتا تھا مگر شام کے وقت اس رش میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔

"لالہ جی! اب مجھے بھی دودھ دے دیں میں بہت دیر سے کھڑا ہوں۔"

یہ سن کر لالہ جی نے اس کے ہاتھ سے پچاس روپے کا نوٹ اور بالٹی لے لی۔ اتنی دیر میں ایک ادھیڑ عمر شخص بولا۔

"لالہ جی! مجھے ایک جگہ کام جانا ہے پہلے مجھے دودھ دے دیں۔"

"جعفر صاحب! پہلے آپ دودھ لے لیں۔"

لالہ جی نے یہ کہہ کر اسٹیل کی بالٹی ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ سے پکڑ لی۔ عثمان کو بہت غصہ آرہا تھا۔

"عثمان بیٹے! تمہیں بھی دودھ مل جائے گا بس ذرا صبر سے کام لو۔"

"لالہ جی! اب میں مزید صبر نہیں کر سکتا، مجھے آپ دودھ دے ہی دیں۔"

عثمان بیزار لہجے میں بولا۔ کچھ دیر بعد لالہ جی نے بالٹی میں آدھا کلو دودھ ڈال کر باقی پیسے عثمان کو تھما دیئے۔ عثمان نے رش سے نکل کر روپے گنے تو پچاس روپے کا ایک نوٹ زیادہ تھا۔

"یہ پچاس روپے میرے ہیں میں ان سے مزے دار چیزیں کھاؤں گا، ویڈیو گیمز کھیلوں گا، خوب سیر کروں گا بہت مزا آئے گا۔"

عثمان بڑبڑایا۔ عثمان گھر میں امی جان کو دودھ دے کر مارکیٹ میں آگیا وہاں رات کے وقت بھی دن کا سا سماں تھا۔ دائیں طرف ایک شخص برگر بنا رہا تھا عثمان نے بیس روپے کا برگر کھایا، برگر کے بعد بارہ روپے کا آئس کریم کپ کھایا۔ جب ایک گھنٹے بعد وہ گھر پہنچا تو اس کی جیب خالی مگر پیٹ بھرا ہوا تھا۔ لالہ جی کے پچاس روپوں سے اس نے خوب عیش کی تھی وہ رات سونے کے لیے لیٹا تو اچانک اس کے کانوں میں چند آوازیں پڑیں اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا وہ گھبرا سا گیا۔ اب پھر ایک آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"میں تمہیں سزا دلواؤں گا، سخت سزا۔"

"کک..... کک کون ہو تم۔؟ عثمان ہکلا گیا۔

"میں وہ گناہ ہوں جو تم نے لالہ جی کے پچاس روپے خرچ کر کے کیا ہے تمہیں اب سزا ملے گی تم اب سخت سزا سے کسی طرح نہیں بچ سکو گے، تمہیں ضرور سزا ملے گی۔"

یہ سن کر عثمان چلایا۔ "نہیں، نہیں مجھے چھوڑ دو، مجھے معاف کر دو۔" یہ چلاتے ہوئے عثمان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے بستر پر تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ وہ ایک

بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ لالہ جی کے پچاس روپوں نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی، مگر اب نیند اس سے کوسوں دُور تھی۔ صبح تک وہ اسی بے چینی میں مبتلا رہا آخر اس نے کچھ سوچنے کے بعد ایک فیصلہ کیا۔ صبح کے وقت وہ لالہ جی کے سامنے کھڑا تھا، وہاں حسبِ معمول گاہکوں کا بہت رش تھا۔ عثمان کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا جب گاہکوں کی بھیڑ کم ہوئی تو عثمان آگے بڑھا۔

"لالہ جی! میں آج آپ سے دودھ لینے کی بجائے ایک جرم کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔"

"کیسا جرم؟" لالہ جی فوراً بولے۔ اس کے جواب میں عثمان نے ساری بات لالہ جی کے گوش گزار کر دی۔ تمام بات جان کر لالہ جی اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے، میں تمہیں پچاس روپے معاف کرتا ہوں تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ انسانی کردار اس دودھ کی طرح ہوتا ہے جس میں ایک گندہ قطرہ بھی مل جائے تو سارا کردار گندہ ہو جاتا ہے، تم نے میرے پاس آکر بہت اچھا کیا ہے میں تم سے بہت خوش ہوں۔"

یہ سن کر عثمان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

(پہلا انعام: 200روپے کی کتب)

فرض

(ماریہ محمود، شاہ پور)

"ارے تم کیوں اٹھا رہی ہو یہ کاغذ اور مالٹوں کے چھلکے، کنیز خالہ کس لیے ہیں۔" میری دوست فضہ نے مجھے جماعت میں سے کاغذ اٹھاتے دیکھا تو بولی۔

"اپنے اردگرد کے ماحول کی دیکھ بھال کرنا تو ہم سب پر فرض ہے، اگر ہم میں سے ہر فرد اپنے حصے کا کام کرے گا تو کسی ایک پر بوجھ نہیں پڑے گا، میں تو اپنے حصے کا کام کر رہی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

تو ٹھیک ہے تم کام کرتی رہو، میں بھی دیکھتی ہوں کے تمہارے علاوہ کون نوکر بننا چاہتا ہے۔" فضہ نے میرا جواب سن کر کہا۔

"یہ سکول ہمارا گھر ہے اور اپنے گھر کو صاف رکھنے سے

کوئی نوکر نہیں بن جاتا۔" میں نے کہا۔

"خیر کچھ بھی ہو میں صفائی نہیں کروں گی میں کھیلنے جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر فضہ نے ٹافی کھائی اور اس کا ریپر زمین پر پھینک کر چل پڑی۔ مجھے صاف ستھرا ماحول بہت پسند ہے، میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی اور ویسے بھی یہ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اپنے اردگرد صفائی کا خیال رکھیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرے اس عمل سے دُوسرے لوگ بھی فرض شناس ہو جائیں گے۔ میں نے ریپرز جمع کیے اور انہیں کوڑے والی ٹوکری میں پھینک دیا۔

اتنے میں اسمبلی کی گھنٹی بج گئی اور میں بھی اسمبلی میں شامل ہو گئی۔

اگلے دن جب میں ریپرز اٹھا رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ کچھ اور لڑکیاں بھی میرے ساتھ کام کروا رہی ہیں اس طرح کام بہت جلد ہو گیا۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، جہاں کام آدھے گھنٹے میں ہوتا تھا اب پانچ منٹ میں ہو جاتا تھا۔ اس طرح اتفاق سے کام کرتے ہوئے کسی ایک پر بوجھ نہ پڑتا تھا اور کنیز خالہ سے ہمیں دُعائیں بھی ملتی تھیں۔ جب وہ دُعائیں دیتیں تو ہمیں بہت خوشی ہوتی۔

ہمارے کام کی بہترین اجرت دُعاؤں کے علاوہ ہو بھی کیا سکتی تھی۔

فضہ اپنے رویے پر شرمندہ تھی اور اب تو وہ بھی ہمارے ساتھ مدد کرواتی تھی۔

ہمارے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ ہمارے والدین کی دعائیں، ہمارے اساتذہ کی محنت اور بہت سے لوگوں کی دُعائیں ہمارے ساتھ تھیں۔

جب ہمارا رزلٹ آیا تو ہماری خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی، ہماری کلاس کا رزلٹ سو فیصد تھا۔ اب جب بھی کوئی نیکی کا موقع ملتا ہے تو ہم اسے ضائع نہیں کرتے۔

ہم سب پاکستان کے شہری ہیں ہم سب کا فرض ہے کہ ہم دل لگا کر پڑھیں، ملکی قوانین کی پابندی کریں، ہمارے قول و فعل سے کسی کو نقصان نہ پہنچے اور اگر کوئی ذمہ داری ہمارے سپرد کی جائے تو اِسے احسن طریقے سے بجھائیں۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

نفع کا سودا

(اسد سلیم، حویلیاں)

عمیر کے قدم رک گئے، اسے ایک دُکان پر یہ الفاظ لکھے نظر آئے۔ "خریدا ہوا مال خوشی سے واپس کریں۔"

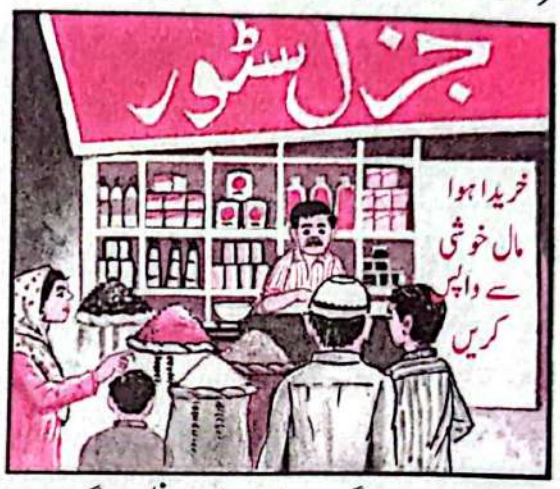

اس سے رہا نہ گیا۔ وہ دُکان میں داخل ہو گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دُکان میں کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ اُس نے قدرے شرما کر کہا "معاف کرنا بھائی! آپ نے غلطی سے یہ جملہ لکھوا کر لگایا ہے کہ خریدا ہوا مال خوشی سے واپس کریں جب کہ ہم نے ہمیشہ دُکانوں پر یہ لکھا ہوا دیکھا ہے

"خریدا ہوا مال واپس نہیں ہو گا۔"

"نہیں، میں نے خود یہ جملہ لکھوایا کر لگایا ہے۔"

یہ سن کر عمیر کو اور زیادہ حیرت ہوئی دُکان دار اس کی حیرت پر مسکرایا، پھر بولا۔

"آپ کرسی پر بیٹھ جایئے مجھ سے جو شخص بھی یہ بات پوچھتا ہے تو میں اُسے اس کی وجہ ضرور بتاتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" عمیر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ایک روز نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا۔ اس خطبے میں آپ ﷺ نے فرمایا۔

"جو دُکان دار کوئی سودا فروخت کرے اور گاہک کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کا وہ سودا واپس کرنا چاہے اور دُکان دار خوشی سے سودا واپس لے لے تو ایسا دُکان دار جنتی ہے۔"

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک سن کر ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے ایک بازار میں دُکان کھولی۔ وہ ایک سال تک دُکان دار کرتے رہے۔ پھر ایک دن ان سے ایک شخص سودا خرید کر لے گیا۔ ایک دو دن بعد وہ واپس کرنے آیا اور بولا۔

"بھائی! میں آپ سے یہ سودا خرید کر لے گیا تھا، میں یہ واپس کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ صحابی رضی اللہ عنہ یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑے، فوراً بولے۔

"اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں تو ایک سال سے اسی انتظار میں تھا، لایئے سودا۔"

انہوں نے سودا واپس لے لیا، اس کی قیمت گاہک کو لوٹائی اور دُکان ختم کر دی۔ وہ دُکان ختم کر کے گھر جانے لگے تو بازار میں کسی نے ان سے پوچھا: "بھائی! کیا بات ہے؟ اچانک کاروبار بند کر کے کیوں جا رہے ہیں، کیا نقصان ہو رہا ہے؟"

جواب میں صحابی رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا۔

"جی نہیں، میں نے تو بہت زیادہ نفع کمایا ہے۔ میرے تو وارے نیارے ہو گئے ہیں۔ ایک سال تک میں جس مقصد کے لیے بیٹھا رہا، وہ آج پورا ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد سنایا۔

تو اے میرے عزیز! جب میں نے پیارے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک سنا، میں نے فوراً ایک تختی پر یہ الفاظ لکھوا کر لگا دیئے۔ اب آپ بتایئے، میں نے نفع کا سودا کیا ہے یا گھاٹے کا؟" یہ کہتے ہوئے دُکان دار مسکرا اٹھا۔

عمیر کے چہرے پر چمک آ گئی۔ وہ بول اٹھا۔

"اس میں شک نہیں کہ آپ نے سو فیصد نفع کا سودا کیا ہے۔"

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

کہانی کاغذ کی

رانا محمد شاہد (بورے والا)

کاغذ..... کب کیسے اور کہاں بنا، اس کے لیے ہمیں اس کی تاریخ میں جانا پڑے گا۔ دُنیا میں سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت بے شمار صنعتیں وجود میں آئیں۔ آج ہم اپنے اردگرد نگاہ دوڑائیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ کاغذ دُنیا کی تمام ترقیوں کی بنیاد بنا ہے۔ چند لمحوں کے لیے تصور کیجیے اگر کاغذ نہ ہوتا تو آج انسان کتنا بے بس و مجبور ہوتا۔ یہ مضمون میں نے ایک کاغذ پہ لکھا ہے اور آپ جہاں سے یہ مضمون پڑھ رہے ہیں وہ بھی ایک کاغذ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعلیٰ دماغ سے نوازا۔ اس لیے انسان باقی مخلوقات سے افضل قرار پایا۔ کاغذ کی ایجاد سے پہلے انسانی خیالات محدود تھے۔ یوں اس کا علم بھی محدود تھا۔ کاغذ کی ایجاد نے انسانیت کے لیے علم کے دروازے کھول دیے۔ یعنی علم اب کسی خاص شخص یا علاقے تک محدود نہیں رہا۔ کاغذ کی وجہ سے یہ علم ہر شخص کے پاس پہنچا۔

جب کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا تو لوگوں کو خیالات کی منتقلی کے لیے مختلف ترکیبوں پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ بعض لوگ حافظے پر اعتماد کرتے تھے۔ پھر اس حافظے میں موجود خیالات کو نسل در نسل اور سینہ بہ سینہ منتقل کرتے چلے جاتے تھے۔ کہیں مٹی کی تختیوں پر لکھا جاتا تھا تو کہیں پتھر کی سلیس لکھنے کے کام آتی تھیں۔ کہیں درختوں کے پتوں پر الفاظ کندہ کیے جاتے تھے اور کہیں اس مقصد کے لیے جانوروں کی کھال اور جھلی استعمال ہوتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ کاغذ کے لیے سب سے پہلی پیش رفت مصریوں نے کی۔ مصری کاغذ تو ایجاد نہ کر سکے البتہ پیپرس نامی درخت کے گودے سے کاغذ جیسی ایک شے بنا لیتے تھے۔ پیپرس نامی درخت دریائے نیل کے کنارے اگا کرتا تھا۔ آج سے تقریباً پانچ ہزار سال قبل مصریوں نے پیپرس درخت کو کاغذ بنانے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ مصری بڑی محنت کے بعد جو کاغذ تیار کرتے تھے۔ ابتدا میں یہ کاغذ سفید ہوتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ بھورا ہوتا جاتا۔ یہ کاغذ معیار کے اعتبار سے اچھا نہیں تھا۔ یوں بالآخر اس کاغذ کا استعمال ختم ہو گیا۔ تیسری اور ساتویں عیسوی کے درمیان صرف چمڑا ہی لکھنے کے لیے

استعمال ہوتا تھا۔ مسلمان یورپ میں آئے تو صرف یہی ایک چیز لکھنے کے کام آتی تھی۔ مسلمانوں کا یہ کارنامہ تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا کہ انہوں نے کاغذ سازی کے فن کو ساری دُنیا میں پھیلا دیا۔ گوکہ کاغذ سازی کے موجد چینی ہیں لیکن جو عروج اس صنعت کو مسلمانوں نے دیا وہ کسی اور قوم یا مذہب کے حصے میں نہیں آیا۔ 751ء میں سمر قند پر چینیوں نے حملہ کر دیا۔ اُس وقت اُس شہر پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس جنگ میں چینیوں کو شکست ہوئی، بہت سے لوگ گرفتا ہوئے۔ گرفتار ہونے والے ان قیدیوں میں چند ذہین و ہوشیار کاغذ ساز بھی تھے۔ انہوں نے اس کی تیاری کی ترکیب مسلمانوں کو بتا دی۔ مسلمان علم و فن کے پیاسے تھے، وہ کاغذ سازی میں دل و جان سے مشغول ہو گئے۔ چینی کاغذ ساز جس منزل پر صدیوں میں پہنچ سکتے تھے مسلمان چند برسوں میں پہنچ گئے۔ اپنی تحقیق کی روشنی میں انہوں نے کاغذ میں نفاست پیدا کی۔ کاغذ کے اندر ریشوں کی درمیان والی جگہ کو پُر کرنے اور کرارہ کرنے کے لیے تحقیق کی۔ کاغذ سازی پر ضخیم کتابیں لکھیں۔ ایشیا اور شمالی افریقہ کے بعد یورپ میں بھی مسلمانوں نے کاغذ سازی کی صنعت کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

بارہویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے ہسپانیہ کے مسلمانوں نے کاغذ سازی کی ابتدا کی۔ ہسپانیہ کے بعد بہت جلد یہ فن فرانس اور ہالینڈ میں بھی پھیل گیا۔ ہسپانیہ کے بعد اطالیہ کاغذ سازی کا سب بڑا مرکز تھا۔

پندرہویں صدی میں انگلستان میں کاغذ سازی کی ابتداء ہوئی۔ جب تک کاغذ پہ ہاتھ سے لکھا جاتا رہا، اس کے سائز یعنی لمبائی چوڑائی وغیرہ کا کوئی خاص تعین نہ تھا لیکن اٹھارہویں صدی میں چھپائی کی مشین ایجاد ہونے کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کاغذ ایک خاص سائز کے ہوں اور زیادہ مقدار میں بنائے جائیں۔ یوں اس مشین کی ایجاد سے کاغذ زیادہ تعداد میں تیار ہونے لگا۔

کاغذ سازی کے لیے پہلی مشین فرانس کے لوئی رابرٹ نے بنائی۔ اس مشین کی ایجاد نے کاغذ سازی کے فن کو ترقی دی اور وہ مشکلات حل ہو گئیں جو اس ایجاد سے پہلے محققین کے ذہنوں میں تھیں۔ انگلینڈ میں اس مشین کو ہنری فورڈ نے بنایا۔ گو بعد میں اس کی کمپنی دیوالیہ ہو کر ختم ہو گئی تاہم اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔ کیونکہ کاغذ سازی کی یہ مشین آج بھی اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔ پہلے کاغذ محدود تعداد اور محدود اقسام میں تیار ہوتا تھا لیکن مشین کی ایجاد کے بعد موٹا، باریک اور چکنا کاغذ بہت کم قیمت پر تیار کیا جانے لگا۔

آپ کو یہ پڑھ کر یقیناً حیرت ہو گی کہ دستی کارخانے میں جتنا کاغذ ایک سال میں تیار کیا جاتا ہے یہ مشین ایک دن میں تیار کر لیتی ہے۔ دستی کاغذ آج بھی تیار ہوتا ہے لیکن بہت محدود پیمانے پر۔ اس کی وجہ یہ ہے اس کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں دستی کاغذ مصوری وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

برصغیر میں کاغذ سازی کی جدید صنعت 1876ء میں بالی کے مقام پر قائم ہوئی۔ اس کے بعد برصغیر میں مختلف کمپنیوں نے کاغذ سازی کے لیے کارخانے قائم کیے۔ 1918ء میں انڈین پیپر نامی کمپنی نے بانس کے گودے سے کاغذ بنایا۔ بانس کے علاوہ دُوسری ریشہ دار اشیاء سے بھی کاغذ تیار کیا جاتا ہے مثلاً گھاس سے بھی کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔ اخباری کاغذ میں عمدگی اور نفاست نہیں ہوتی۔ یہ میکانی گودے سے بنایا جاتا ہے اور اس قسم کا کاغذ پہاڑی لکڑیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ چونکہ پہاڑوں سے لکڑی کاٹ کر لانے میں بہت زیادہ پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ اس لیے اس قسم کے کاغذ کی تیاری کی طرف توجہ نہیں دی لیکن اب اس طرف توجہ دی جارہی ہے اور اُمید کی جارہی ہے کہ جلد ہی تحقیقات و تجربات کے ذریعے پاکستان و ہندوستان میں بھی اخباری کاغذ بڑے پیمانے پر تیار کیا جانے لگے گا۔

---☆☆---

☆اُستاد: (طلبا سے) "کل میں نے تمہیں دوست کے نام خط لکھنے کو کہا تھا، کیا وہ خط لکھ لائے ہو؟"
طلبہ: "جی ہاں۔"
اُستاد: "لاؤ، دستخط کر دوں۔"
طلبا: "جناب! خط تو ہم لیٹر بکس میں ڈال آئے ہیں۔"
(قمر ناذ دہلوی، کراچی)

☆ایک صاحب نے ایک دیہاتی آدمی کو نوکر رکھا، پہلے دن صاحب نے کہا صبح میں نے جلدی دفتر جانا ہے میرے کپڑے استری اور بوٹ پالش کر دو۔ صبح جب صاحب نے اپنے کپڑے دیکھے تو حیران رہ گئے۔ ملازم نے کپڑے پالش اور بوٹ استری کر دیئے تھے۔
(سفیر، فتح جنگ)

☆استاد: "بے بس کسے کہتے ہیں؟"
شاگرد: "جس کے پاس بس نہ ہو اُسے بے بس کہتے ہیں۔"
(عتیقہ فخر، کوٹسارنگ)

☆ایک بے وقوف نے کبھی آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ ایک روز راستے میں اُسے ایک آئینہ پڑا ہوا ملا۔ اس نے اٹھا کر دیکھا تو آئینے میں اسے اپنی شکل نظر آئی۔ اس نے آئینہ وہیں رکھا اور بولا۔
"معاف کیجئے، مجھے معلوم نہیں تھا یہ آئینہ آپ کا ہے۔"
(سارہ طارق، فیصل آباد)

ایک بار ایک بچہ سخت بیمار تھا، اس کی ماں نے اس سے کہا کہ دوا کھالو۔
بیٹا: (ضد کرتے ہوئے) "نہیں میں نہیں کھاؤں گا۔"
ماں: "دوا کیوں نہیں کھاؤ گے؟"
بیٹا: (معصومیت سے)۔ اس پر لکھا ہے تمام دوائیں بچوں کی پہنچ سے دُور رکھیں۔
(محمد تنویر انگراء، پیلو وینس)

☆استاد: (شاگرد سے) "5 پھلوں کے نام بتاؤ۔"
شاگرد جناب: "دو سیب اور تین کیلے۔"
(محمد وقار الاسلام، ڈیرہ غازی خان)

☆ایک بے وقوف برف کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ دُوسرے نے پوچھا۔
"کیا دیکھ رہے ہو؟"
پہلا بے وقوف بولا: "دیکھ رہا ہوں کہ یہ اتنی دیر سے "لیک" کہاں سے ہو رہی ہے۔"
(محمد آصف ریاض، جھنگ)

☆کسی گاؤں کے استاد نے ایک طالب علم کے والد کو سکول میں بلایا اور کہا۔
"آپ کا بیٹا پڑھائی میں کمزور ہے۔"
باپ نے جواب دیا: "کوئی بات نہیں اسے طاقت کے ٹیکے لگوا دوں گا۔"
(محمد اکبر جاوید، ڈیرہ غازی خان)

☆میاں بیوی آپس میں لڑ رہے تھے۔
بیوی کہنے لگی: "یا خدایا، میں کون سی چیز کھا کر مر جاؤں۔"
باہر سے چھابڑی والے کی آواز آئی۔ "گرما گرم سموسے۔"
(فصیحہ اشرف، مرید کے)

☆اُستاد: (شاگرد سے): "موسلا دھار کو جملے میں استعمال کرو۔"
شاگرد: "سر! مجھے تو موسلا دھار کا مطلب ہی نہیں آتا۔"
استاد: "موسلا دھار کا مطلب ہے بہت تیز۔"
شاگرد: (جلدی سے) "آج میں موسلا دھار دوڑا۔"
(رامین مہتاب، میاں والی)

ایک دوست نے دُوسرے دوست سے کہا۔
"کوئی ایسا کاروبار بتاؤ جس میں بہت زیادہ منافع ہو؟"
دُوسرے دوست نے جواب دیا۔
"ایسا کرو سردی میں سستی برف لے کر گرمیوں میں بیچا کرو۔"
(نور العین، لاہور)

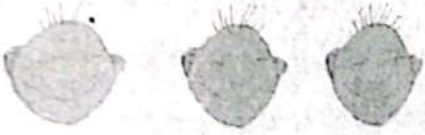

خوشبو سب کے لیے

ذیشان بن صفدر (کراچی)

نیند سے بیدار ہوتے ہوئے وامق کی نظر الماری میں رکھے پلاسٹک کے پھولوں سے بنے گل دستے پر پڑی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی۔ اُس کے رخسار گلاب کی پنکھڑیوں کے مانند دمکنے لگے اور وہ اپنے بستر سے اٹھ کر سیدھا لان میں کھلے پھولوں کے پودوں کے پاس پہنچ گیا۔

اس کے لان میں طرح طرح کے رنگ برنگے، خوش بو دار پھولوں کے پودے کیاریوں میں لگے تھے۔ ان پھولوں میں سرخ، سفید گلاب، زرد گیندے، سدا بہار کے گلابی پھول اور کئی انگریزی پھولوں کے پودے بھی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ان سب پودوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گملا رکھا ہوا تھا جس میں گلاب کا پودا تھا اور پودے کی شاخ پر ایک سرخ، چھوٹا سا گلاب مسکرا رہا تھا۔ وامق آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اُس گملے کے قریب پہنچ گیا اور گلاب کی شاخ پر ہلکورے لیتے پھول کو دیکھنے لگا۔

ننھے مسکراتے پھول کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے موتی کی طرح دمک رہے تھے۔ شبنم کے دمکتے قطروں کو وامق غور سے دیکھنے لگا۔ وہ قدرت کی کاری گری کے متعلق سوچنے لگا پھر وہ اپنی ناک پھول کے قریب لے جاکر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا..... جیسے وہ پھول کی بھینی بھینی خوش بو اپنے بدن میں بھر لینا چاہتا ہو..... یہ خوش بو اُسے چاکلیٹ اور حلوے کی خوش بو سے بھی کہیں زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ کی مدد سے شاخ پر جھولتے ہوئے پھول کو اپنے قریب کر کے گہری گہری سانس لے کر اُسے سونگھنے لگا۔ اُس نے پھول کو اپنے رخسار سے بھی لگایا۔ اس کے ٹھنڈے اور نرم سے لمس نے اس کے گالوں کی رنگت میں اپنا رنگ ملا دیا۔ اب اس کے رخسار بھی گلاب کی پنکھڑیوں کے مانند سرخ ہو گئے۔ اسے اپنے جسم میں گدگدی ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی..... آنکھوں کی چمک بھی بڑھ گئی۔ یہ دراصل اس کی دلی خوشی کا اظہار تھا..... ربڑ کے کھلونے یا ٹی وی کے کارٹون بھی اسے اتنا لطف نہیں دیتے تھے جتنا شاخ پر لگا گلاب کا یہ پھول دے رہا تھا۔

اسی لمحے فضا میں ایک چڑیا اڑتی ہوئی کہیں سے آگئی۔ اُس کے ساتھ ایک رنگین، خوب صورت تتلی بھی تھی۔ وامق تتلی دیکھ کر اور بھی خوش ہو گیا۔ اُس نے دیکھا وہ رنگین خوب صورت تتلی اس کے پھول کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وامق نے چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا..... شائد یہ رنگین خوب صورت تتلی اس کے پھول کو توڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئی ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں

سوچا بھلا اُس کے وہاں موجود ہوتے ہوئے شاخ پر کھلے اُس پھول کو کوئی کیسے لے جا سکتا ہے..... یا اس پھول کی خوش بو اس کے علاوہ کوئی اور کیسے سونگھ سکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ تتلی کو وہاں سے بھگا دینے کی کوشش کرنے لگا، لیکن تتلی بھلا اس کے بھگانے سے کہاں بھاگنے والی تھی۔ وامق نے اپنے پھول کو تتلی سے بچانے کی ٹھان لی تھی۔ تتلی نے بھی سوچ لیا کہ وہ وامق کی کوشش کو کام یابی سے ہمکنار نہیں ہونے دے گی..... وہ اُس پھول کی خوش بو سے اپنے دل ودماغ کو معطر کر کے ہی رہے گی..... تتلی ایک پھول کے پودے سے اڑ کر دُوسرے پودے کی طرف بڑھ جاتی۔ پھر جیسے ہی وامق اس پودے کی طرف بڑھتا وہ کسی اور پودے کی طرف اڑ جاتی۔ جیسے وامق کو چیلنج کر رہی ہو کہ مجھے بھگا کر دکھاؤ۔

تتلی کے پیچھے بھاگتے، بھاگتے وامق پریشان ہو گیا تھا۔ اب تو اسے تھکن بھی محسوس ہونے لگی تھی..... جب کہ اسے تتلی پر تھکن کا کوئی اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی..... سانسیں بھی تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ چہرے پر پسینے کے قطرے اس طرح چمکنے لگے تھے جیسے پھول کی پنکھڑیوں پر شبنم کے موتی..... آخر وہ اپنی ہار مان کر ایک درخت کے قریب بیٹھ گیا..... ہوا کا ایک لطیف جھونکا جب اس کے تھکے ہوئے بدن سے لگا تو اسے بہت ہی اچھا محسوس ہوا۔

یہ سب اس معصوم تتلی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اُس نے سوچا تتلی کتنی اچھی ہے۔ اس نے صبح سویرے مجھے لان میں سبز مخملی گھاس پر ننگے پیر دوڑنے کی مشق بھی کرادی۔ یوں میری ورزش ہو گئی اور مجھے صبح کی ہوا کا لطیف احساس بھی کرا دیا۔ اُس نے پیار بھری نظروں سے تتلی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک گیندے کے پودے پر بیٹھ گئی تھی، مگر اس کی نظریں شاخ پر جھولتے گلاب پر ہی تھیں۔

وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"شائد تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو..... اپنی ناراضگی ختم کر دو..... چلو تم بھی گلاب کی خوش بو سونگھ لو..... میں سمجھ گیا ہوں..... میں سمجھ گیا ہوں..... خوش بو تو سب کے لئے ہے..... اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر نعمت اپنی مخلوق کے لئے ہی پیدا کی ہے..... آجاؤ..... اب میں تمہیں گلاب پر بیٹھنے سے ، گلاب کو سونگھنے سے نہیں روکوں گا۔"

مگر تتلی اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی..... ہاں اُس نے اپنے پروں کو جنبش ضرور دی تھی..... وامق نے محسوس کیا جیسے تتلی اب بھی اُس سے ناراض ہے۔ آخر اُس نے تتلی کو بھی تو خوب تنگ کیا تھا۔ اُسے گلاب کی خوش بو سونگھنے سے روکا تھا۔ میری طرح وہ بے چاری بھی تھک گئی ہو گی..... میں بھی کتنا خود غرض ہوں..... اللہ تعالیٰ خود غرض لوگوں کو پسند نہیں

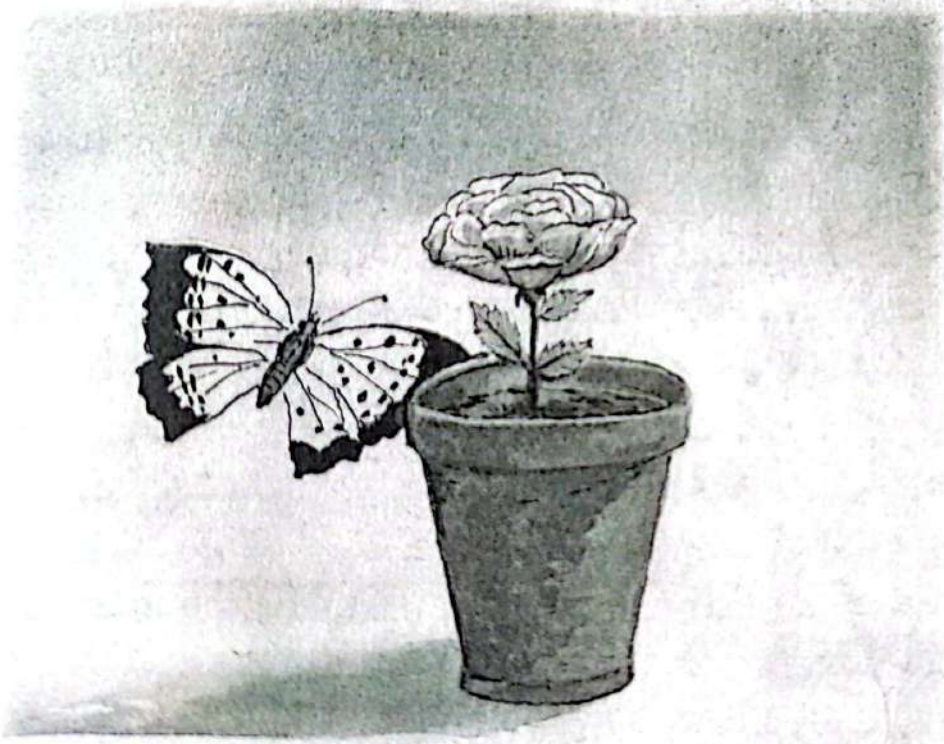

کرتا۔ مجھے معصوم تتلی سے معافی مانگنی پڑے گی۔ اتنا سوچ کر وامق نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر تتلی سے معافی مانگنی شروع کردی۔ وہ بولا۔

"اچھی تتلی! مجھے معاف کردو۔ میں اپنے بُرے عمل پر شرمندہ ہوں۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں..... امی نے بتایا تھا اللہ تعالیٰ بھی اپنے گناہ گار بندوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے..... ان کی معافی پر ان کے قصور معاف کردیتا ہے..... میں بھی اپنے قصور کی معافی مانگ رہا ہوں..... میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوں۔ اپنی خود غرضی پر تم سے معافی چاہتا ہوں۔" پھر اس نے اپنے دونوں کان بھی پکڑ لئے، مگر تتلی اس بار بھی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھی رہی..... اس بار تو اس نے اپنے پر بھی نہیں ہلائے..... وامق سوچ میں پڑ گیا..... "وہ اب کیا کرے۔ میں نے معافی مانگ لی..... ہاتھ بھی جوڑ لئے۔ کان پکڑ لیے، مگر تتلی راضی ہی نہیں ہوتی..... اب کیا کروں؟"

اچانک اُسے یاد آیا..... اور وہ مسکرانے لگا..... اُس نے سوچا شائد تتلی اس سے شرما رہی ہے، وہ بولا۔

"اچھا تتلی رانی تم شرما رہی ہو مجھ سے۔" اس بار تتلی نے دوبار اپنے پروں کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہو، ہاں.....

وامق پھر بولا۔ "کوئی بات نہیں، لو میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔" پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، مگر انگلیوں کے درمیان سے جھانکتا رہا کہ دیکھوں تتلی اب کیا کرتی ہے، جب تتلی اپنی جگہ سے نہ ہلی تو وامق نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔

"اچھا تو تم سمجھ گئیں کہ میں چوری چوری تمہیں دیکھ رہا ہوں..... ٹھیک ہے..... لو..... میں یہاں سے چلا ہی جاتا ہوں۔ تم بے خوف ہو کر گلاب کی خوش بو سونگھو۔" پھر وہ لان سے اپنے گھر کے برآمدے کی طرف چلا گیا۔ برآمدے میں پہنچ کر اُس نے دیکھا۔ تتلی گلاب کے پھول پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ خوش بو تو سب کے لئے ہے، واقعی وہ غلطی پر تھا اور خود غرض بن گیا تھا۔

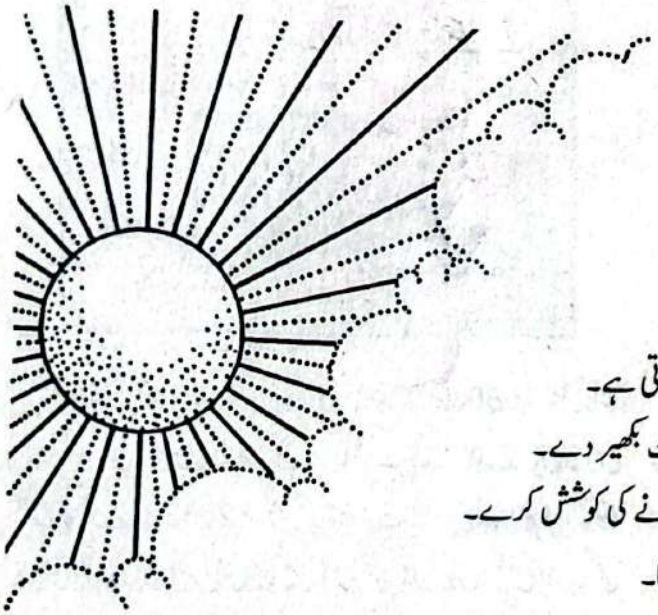

کرنیں

☆ بچت بذات خود آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔

☆ انکساری کا سہارا لے کر چلو ورنہ ٹھوکر کھاؤ گے۔

☆ گفت گو کے لئے ذہانت سے زیادہ اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ نیک کام وہ ہوتا ہے جو دُوسرے کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے۔

☆ ہر شخص کی تعریف کیجئے تاکہ وہ اُس تعریف کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

☆ انسان دُعا سے زیادہ کوئی طاقت ور چیز پیدا نہیں کر سکتا۔

☆ خاموشی اظہارِ نفرت کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔

☆ خطرات و مشکلات کا اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنا حقیقی مردانگی ہے۔

☆ مسکرا کر بات کرنا بعض اوقات مشکل کو آسان بنا دیتا ہے۔

☆ غلامی کا چاہے جو نام بھی رکھا جائے غلامی بہر حال غلامی ہوتی ہے۔

☆ بہترین کی اُمید رکھو اور بدترین کے لئے تیار رہو۔

قمر ناز دہلوی (کراچی)

کوئٹہ

پاکستان کے مشہور شہروں میں کوئٹہ (Quetta) شہر کو اہم مقام حاصل ہے۔ یہ صوبہ بلوچستان کا صدر مقام ہے۔ لفظ کوئٹہ پشتو زبان کے لفظ "KUWATTA" سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے "قلعہ" اپنے جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ نہایت اہم شہر ہے۔ اس کے مشرق میں "زیارت" شہر، مغرب میں "قلعہ عبداللہ" شمال میں "پشین" اور جنوب میں

"مستونگ" شہر موجود ہیں۔ سطح سمندر سے 1680 میٹر بلند اس شہر میں پھلوں کے بکثرت باغات پائے جاتے ہیں۔ اس ضلع کا کُل رقبہ 2653 مربع کلو میٹر ہے۔ بلوچی، براہوی، پشتو، فارسی، اُردُو اور انگریزی زبانیں اس شہر میں بولی، لکھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ یہاں آباد لوگ نسلاً تاجک، ازبک اور ترکمانی ہیں۔ شہر کی آبادی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق مرد 412064 اور خواتین 347877 ہیں۔ اس شہر میں جھیلیں باغات، سکول، کالج اور یونیورسٹی بھی ہے۔ خوب صورت بازار، دیدہ زیب کامدار ملبوسات اور خشک میوے اس شہر کی پہچان ہیں۔ کوئٹہ میں محکمہ آثار قدیمہ کا عجائب گھر بھی ہے جہاں پرانی بندوقیں، تلواریں، خنجر اور تحاریر محفوظ ہیں۔ جیالوجیکل سروے آف پاکستان کا عجائب گھر بھی اس شہر میں ہے جہاں متعدد جانوروں کے رکاز (Fossils) اور چٹانیں (Rocks) نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔ کوئٹہ شہر کی خاص بات یہاں چلتن نیشنل پارک ہے جو کوئٹہ شہر سے 20 کلو میٹر جنوب کی طرف ہے۔ اس پارک کا رقبہ 3000 ہیکٹر ہے۔ اس پارک میں 225 اقسام کے نہایت نایاب پودے اور درخت بھی موجود ہیں۔ یہ شہر 1935ء میں شدید زلزلے میں تباہ ہونے کے بعد دوبارہ بسایا گیا تھا۔ یہ شہر پاکستان کے ماتھے کا جھومر ہے۔

سکوائش

یہ کھیل تقریباً 1500 سال پہلے شروع ہوا تھا، جس میں دو افراد اپنے چھکے سے گیند کو دیوار پر مارتے تھے۔ اپریل

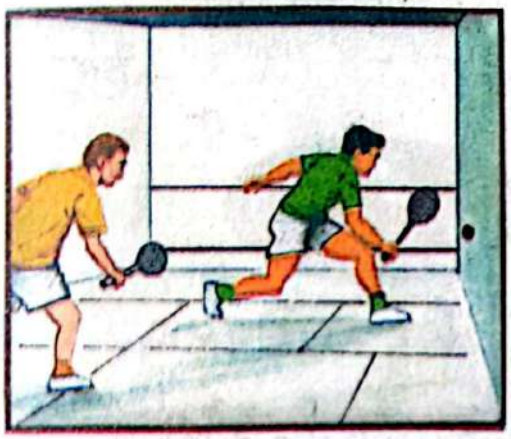

1907ء میں پہلی بار سکوائش کھیلنے کے اصول وضع کیے گئے۔ 1920ء میں سکوائش کے کورٹ کا سائز 9.75 میٹر لمبا (32فٹ)، 6.4 میٹر (20فٹ) چوڑا رکھنے کا قانون بنایا گیا۔ کورٹ کے سامنے دیوار پر 4.57 میٹر (15فٹ) آوٹ لائن فرش سے اوپر ہوتی ہے۔ سامنے والی اسی دیوار پر سروس لائن یا کٹ لائن بھی ہوتی ہے جس کی اونچائی 1.63 میٹر (6فٹ) ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ Net بھی ہوتا ہے۔ جو 48 سینٹی میٹر (14انچ) بلند ہوتا ہے۔ سکوائش ریکٹ کا سائز 686 ملی میٹر لمبائی اور 215 ملی میٹر چوڑائی کا حامل ہوتا ہے۔

اس کا وزن 23 سے 25 گرام ہوتا ہے۔ ورلڈ سکوائش فیڈریشن کے مطابق جون 2009ء میں دُنیا بھر میں 49906 سکوائش کورٹ موجود ہیں۔ دُنیا میں سب سے زیادہ سکوائش کورٹس برطانیہ میں ہیں۔ جن کی تعداد 2009ء میں 8500 تھی۔ دُنیا بھر کے مشہور کھلاڑیوں میں پاکستان سے جہانگیر خان، ہاشم خان، جان شیر خان، اعظم خان، مصر سے ایف ڈی امر بے، محمود کریم اور آسٹریلیا سے جیف سینٹ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

گھوڑا

گھوڑے کو انگریزی زبان میں (Horse) اور عربی زبان میں الخیل کہتے ہیں۔ گھوڑے کا سائنسی نام (Equus Ferus) ہے۔ یہ ہماری دُنیا میں لگ بھگ 50 ملین سال پہلے آیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے 4000 سال پہلے بھی لوگ بڑے شوق سے گھوڑا پالتے تھے۔ ایک گھوڑے کی اوسط

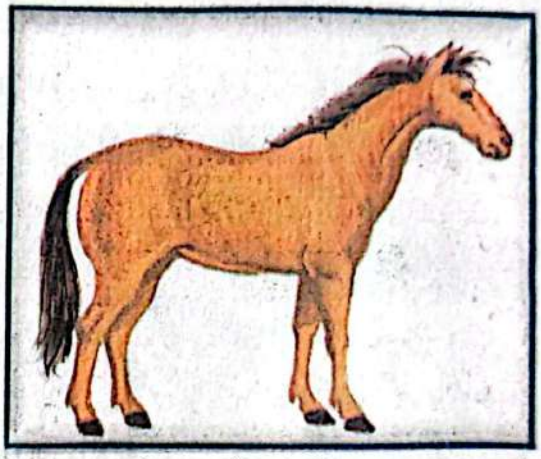

عمر 25 سے 30 برس ہوتی۔ کچھ نسل کے گھوڑے 40 سال بھی عمر پاتے ہیں۔ ان کا اوسط وزن 380 سے 550 کلو گرام ہوتا ہے۔ گھوڑے میں 205 ہڈیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کا شمار دودھ پلانے والے جانوروں یعنی ممالیہ (Mammals) میں ہوتا ہے۔ ایک صحت مند گھوڑا 7 سے 11 کلو خوراک روزانہ کھاتا ہے۔ اونچائی میں گھوڑا 58 انچ یا اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت امام حسینؓ کے گھوڑوں کا ذکر ملتا ہے۔

پیاز

آپ نے پیاز کاٹتے وقت اپنی امی کی آنکھوں سے بہتے آنسو یقیناً دیکھے ہوں گے۔ پیاز کو انگریزی میں onion اور سائنسی اصطلاح میں اس کا نام "Allium cepa" ہے۔ پیاز جسے ہم کاٹ کر سالن پکاتے ہیں درحقیقت زیرِ زمین تنا ہے جسے ہم کاٹ کر کھاتے ہیں۔ قدیم تہذیبوں میں تین پودوں کو خاص مقام حاصل تھا۔ ان میں انجیر، کھجور اور پیاز قابلِ ذکر ہیں۔

لگ بھگ 2000 قبل مسیح مصر میں باقاعدہ پیاز کی کاشت شروع کی گئی۔ پیاز محض سبزی نہیں یہ طبی خصوصیات کا بھی حامل ہے۔ اطباء پیاز سوجن، سانپ کے کاٹے، بخار، شوگر اور قلبی امراض کے علاج میں استعمال کرتے ہیں۔ ماہرین نے دُنیا کے 45 بہترین طبی خصوصیات کے حامل پودوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ جس میں پیاز کا نام بھی شامل ہے۔ پیاز کے کاٹنے سے آنکھوں میں آنسو اس لیے آتے ہیں کہ اس میں

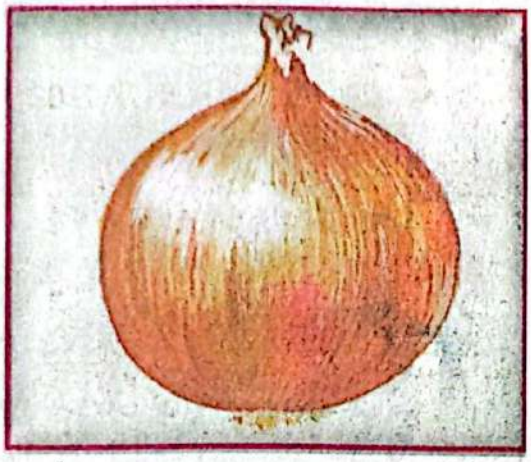

کیمیائی مرکب سلفینک ایسڈ (Sulphenic acid) پایا جاتا ہے۔ پیاز کے کاٹنے پر اس مرکب سے ایک اڑنے والی گیس (Volatile gas) خارج ہوتی ہے۔ یہ آنکھوں کے حسی سیلز کو چھوتی ہے تو آنکھوں سے آنسو نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ادارے FAO کے مطابق 2005ء میں پاکستان کا شمار دُنیا کے ان 10 ممالک میں ہوتا ہے جہاں بکثرت پیاز کاشت و استعمال ہوتا ہے۔ FAO کے معلوماتی پروگرام میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان نے 2005ء میں 764000 ٹن پیاز پیدا کیا تھا۔

معلوماتِ عامہ

☆لاہور سے 45 کلو میٹر کے فاصلے پر موجود شیخوپورہ میں واقع ہرن مینار کی تعمیر کا آغاز جہانگیر نے کیا تھا۔

☆جدید ملائیشیا کے بانی مہاتیر محمد 20 دسمبر 1925ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک سکول ٹیچر تھے۔

☆مہاتیر محمد نے 16 جولائی 1981ء کو ملائیشیا کی وزارتِ عظمیٰ کا حلف اٹھایا اور وہ 30 اکتوبر 2003ء تک مسلسل 22 برس تک ملائیشیا کے وزیر اعظم رہے۔

☆برصغیر پاک و ہند میں تین ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے پورے برصغیر پر حکومت کی تھی اور اِس حکومت کے باعث وہ عالمگیر یا گریٹ کہلاتے تھے۔ ان کے نام اکبر اعظم اورنگ زیب عالمگیر اور اشوک اعظم تھے۔

☆ شیخ سعدی کی حکایات کی کتب گلستان اور بوستان اب تک دُنیا کی 102 زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

(محمد خلیل چودھری، دینہ)

☆سورج کا قطر 8 لاکھ 64 ہزار میل اور زمین کا قطر 7 ہزار 867 میل ہے۔

☆سورج کا زمین سے فاصلہ 9 کروڑ 29 لاکھ میل ہے۔

☆چاند ایک سال میں تقریباً تیرہ بار زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔

☆سورج ہماری زمین سے 10 لاکھ گنا بڑا ہے۔

☆سورج کے شعلے کی بلندی 1 لاکھ 35 ہزار میل ہوتی ہے۔

☆چاند کا محیط 6 ہزار 790 میل ہے۔

☆دُنیا میں سب سے زیادہ کوئلہ پاکستان میں پایا جاتا ہے۔

☆دُنیا میں سب سے زیادہ مساجد بنگلہ دیش کے دارالحکومت ڈھاکہ میں ہیں۔

(محمد جعفر، گروٹ)

☆امریکی ترانے کے خالق فرانسس سکاٹ ہیں۔

☆دریاؤں کا ملک بنگلہ دیش کو کہا جاتا ہے۔

☆ایشیاء کا برازیل اسلام آباد کو کہا جاتا ہے۔

☆اسلام آباد کا نام 24 فروری 1960ء کو رکھا گیا تھا۔

(رمیشہ مہتاب، چشمہ، میاں والی)

☆ٹماٹر میں پانی کی مقدار 95 فی صد ہوتی ہے۔

☆مشروم میں پانی کی مقدار 92 فی صد ہوتی ہوتی ہے۔

☆دودھ میں پانی کی مقدار 87 فی صد ہوتی ہے۔

☆سیب میں 84 فی صد پانی ہوتا ہے۔

☆مچھلی میں پانی کی مقدار 92 فی صد ہوتی ہے۔

☆آلو میں پانی کی مقدار 76 فی صد ہوتی ہے۔

☆انڈے میں پانی کی مقدار 75 فی صد ہوتی ہے۔

☆گائے کے گوشت میں پانی کی مقدار 64 فی صد ہوتی ہے۔

(سلمیٰ صفی، ٹمن)

☆دُنیا کا سب سے پہلا انجینئر ارشمیدس تھا۔

☆پاکستان کے خلائی تحقیقاتی ادارے کا نام سپارکو ہے۔

☆مشہور ریاضی دان فیثا غورث کا تعلق ترکی سے ہے۔

(محمد تنویر انگراء، پیلو وینس)

☆دُنیا کا سب سے بڑا ریگستان مراکش میں ہے۔

☆فاختہ اور کبوتر کو دُنیا میں امن کا نشان سمجھا جاتا ہے۔

☆ہالینڈ کو پھولوں کا دیس کہتے ہیں۔

☆ آسمانی بجلی کے صرف ایک شعلے سے 10 لاکھ بلب روشن کیے جا سکتے ہیں۔

☆دُنیا کا سب سے بڑا پارک کینیڈا کا نیشنل پارک ہے۔

(مہک خالد، کراچی)

☆لنگ فش ایسا جاندار ہے جس کے تین دل ہوتے ہیں۔

☆جاوا اور ملائیشیا ایسے ممالک ہیں جن میں اڑنے والے سانپ پائے جاتے ہیں۔

☆مالدیپ کا دارالحکومت مالے ہے۔

(سلمان احمد بھٹہ، فیصل آباد)

فرق تلاش کریں

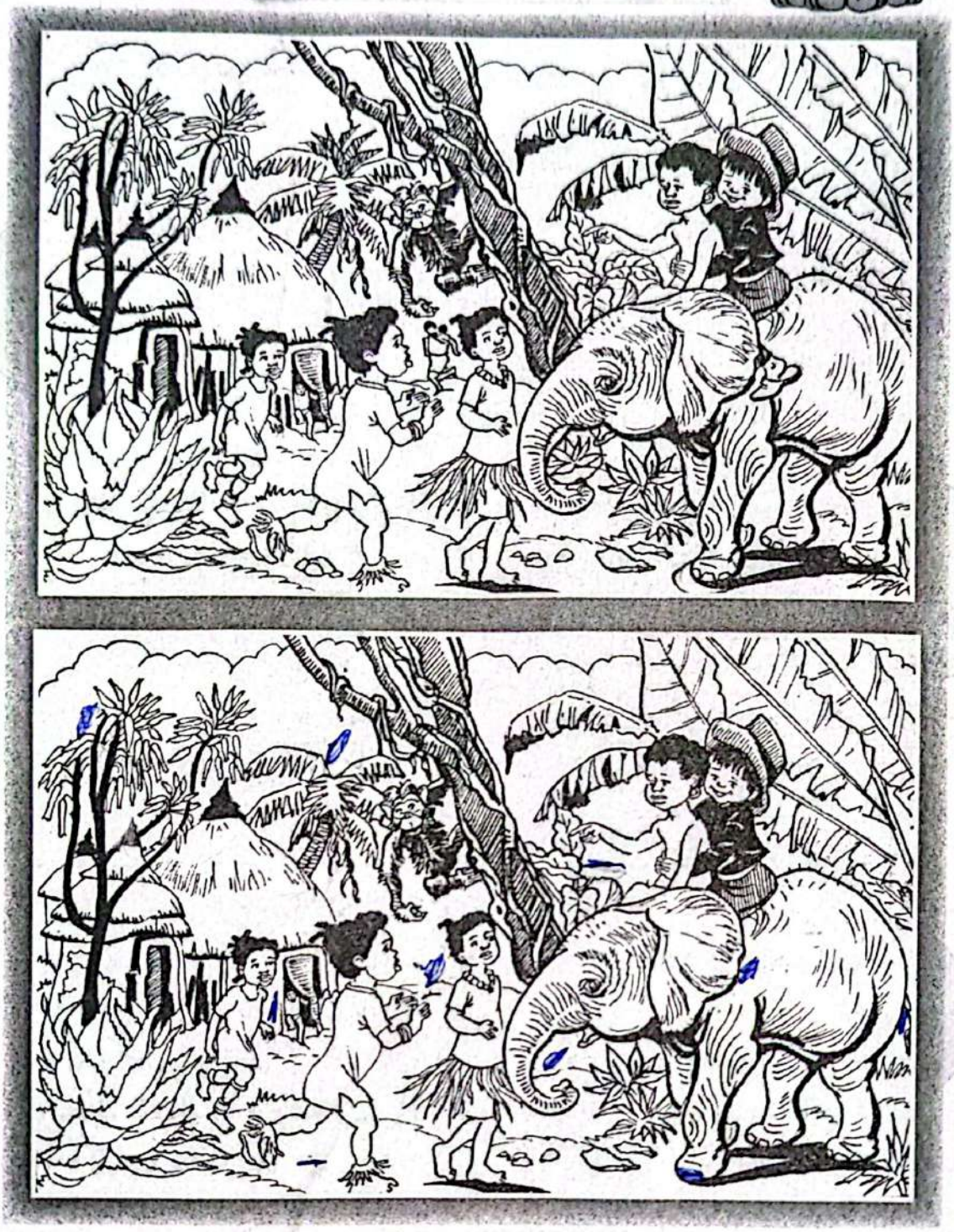

یہ دونوں تصاویر بظاہر ایک جیسی لگ رہی ہیں، لیکن ان میں دس جگہ پر فرق ہے۔

کیا آپ یہ فرق تلاش کر سکتے ہیں؟

اُمیدِ بہار رکھ

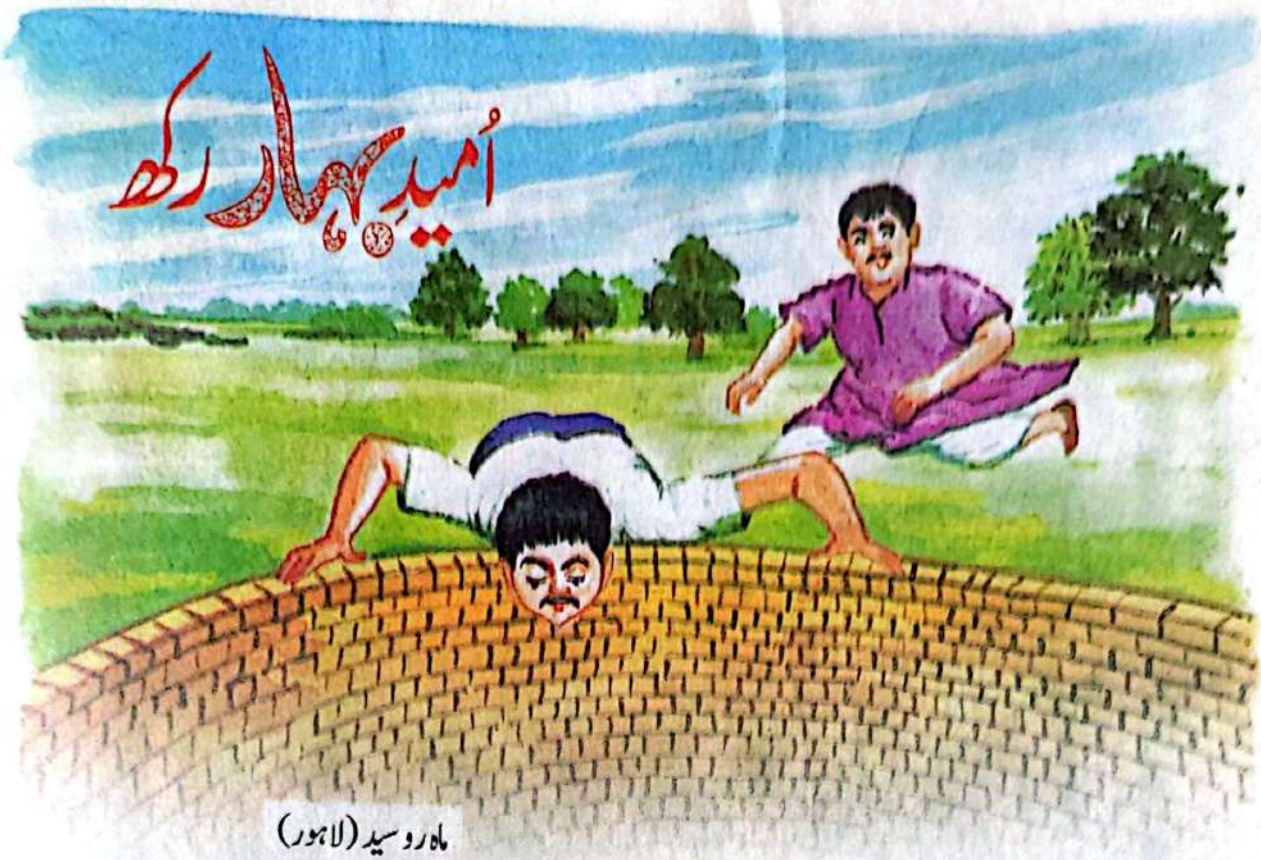

ماہ رو سید (لاہور)

دیہاتی علاقے میں رہائش پذیر رحمت کی عمر 18 برس تھی۔ اُس نے آٹھویں جماعت تک گورنمنٹ سکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر والد کی وفات کے بعد گھر چلانے کی ذمہ داری اس پر آن پڑی تو اُس نے قلم کتاب چھوڑ کر ہاتھوں میں مزدوری کے اوزار تھام لیے۔

اُس کے گھر میں دو ہی افراد تھے، ایک وہ خود اور دُوسری اُس کی والدہ، ہر روز وہ صبح سویرے ناشتہ کر کے مزدوری کرنے کے لئے گھر سے نکل پڑتا تھا۔ کبھی کبھار اُسے گاؤں میں ہی مزدوری مل جاتی تھی اور کبھی مزدوری ڈھونڈنے کے لیے اُسے شہر جانا پڑتا تھا۔ اُس روز بھی رحمت مزدوری کرنے کے لیے چودھری صاحب کی حویلی کی جانب گامزن تھا۔ راستے میں کھیت پڑتے تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں بنا ہوا تھا۔ کھیتوں میں سے گزرتے رحمت کی نظر اچانک کنویں پر پڑی تو وہ ششدر سا رہ گیا کیوں کہ ایک آدمی کنویں پر جھکا ہوا اندر کودنے ہی لگا تھا۔ رحمت تیزی سے اُس آدمی کی جانب دوڑا اور اس سے قبل کے وہ آدمی کنویں میں چھلانگ لگاتا رحمت نے برق رفتاری سے اُسے پیچھے کی جانب کھینچ لیا۔

سانولی رنگت اور معمولی شکل وصورت کا حامل، دھان پان سا وہ آدمی با مشکل 30 سال کا تھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس آدمی نے رحمت سے خود کو چھڑواتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آپ کنویں میں چھلانگ کیوں لگا رہے تھے؟ پتا ہے کنواں کس قدر گہرا ہے۔ کنویں میں کودتے ہی مر جانا تھا آپ نے۔"

رحمت کچھ غصے، پریشانی اور تشویش کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اُسے دیکھتے ہوئے بولا جو لہلہاتی فصلوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تو مر جاتا، کم از کم اِس عذاب جیسی زندگی سے تو چھٹکارا مل جاتا مجھے۔"

وہ آدمی بھرائی ہوئی آواز میں بولا تو رحمت نے اُس کے کندھے پر تسلی دینے کے انداز میں ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کیوں مرنا چاہتے تھے؟"

"مرنا چاہتا تھا نہیں، چاہتا ہوں....." اُس آدمی نے آنسو پونچھتے ہوئے اتنا کہا تو رحمت چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ خاموشی کی اِس دیوار کو اُس آدمی نے ہی توڑا تھا۔

"میرا نام شوکت ہے۔ بیوی بچوں اور اپنی بوڑھی ماں کا پیٹ پالنے کے لئے مزدوری کرتا ہوں۔ گھر کا واحد کفیل ہوں۔ کبھی تو دیہاڑی مل جاتی ہے اور کبھی نہیں، ڈیڑھ ہفتہ پہلے تک تو یہ ہوتا آیا تھا کہ ایک دن مزدوری ملتی تھی تو اُس کے بعد زیادہ سے زیادہ دو دن مزدوری نہیں ملتی تھی۔ اِس لئے پہلے دن کی مزدوری کو کھینچ تان کر چلا لیا کرتے تھے۔ آج ڈیڑھ ہفتہ ہونے کو آیا ہے۔ مجھے مزدوری نہیں ملی۔ شروع شروع میں تو ہم نے کسی طرح گزارا کر لیا، لیکن مہنگائی اتنی ہے کہ گھر کی ساری جمع پونجی 7دنوں میں خرچ ہو گئی، تین دن ہو گئے ہیں ہمیں فاقے کرتے ہوئے۔ بھیک مانگنا میری غیرت کو گوارا نہیں۔ میں نے مزدوری کے لیے بہت ٹھیکیداروں سے بات کی۔ جو لوگ بھی مجھ سے گھروں کی مرمت کروایا کرتے تھے۔ اُن سے رابطہ کیا کہ کچھ مرمت کروانا ہو تو بتا دیں۔ بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود۔ کسی نے مجھے کام نہیں دیا۔ میرے چھوٹے بیٹے کو پرسوں سے بہت تیز بخار ہے لیکن نہ تو ہمارے پاس اسے دینے کے لیے دوا ہیں اور نہ ہی خوراک۔ نہیں برداشت ہوتا مجھ سے یہ سب کچھ۔اس لیے مرنا چاہتا ہوں میں۔"

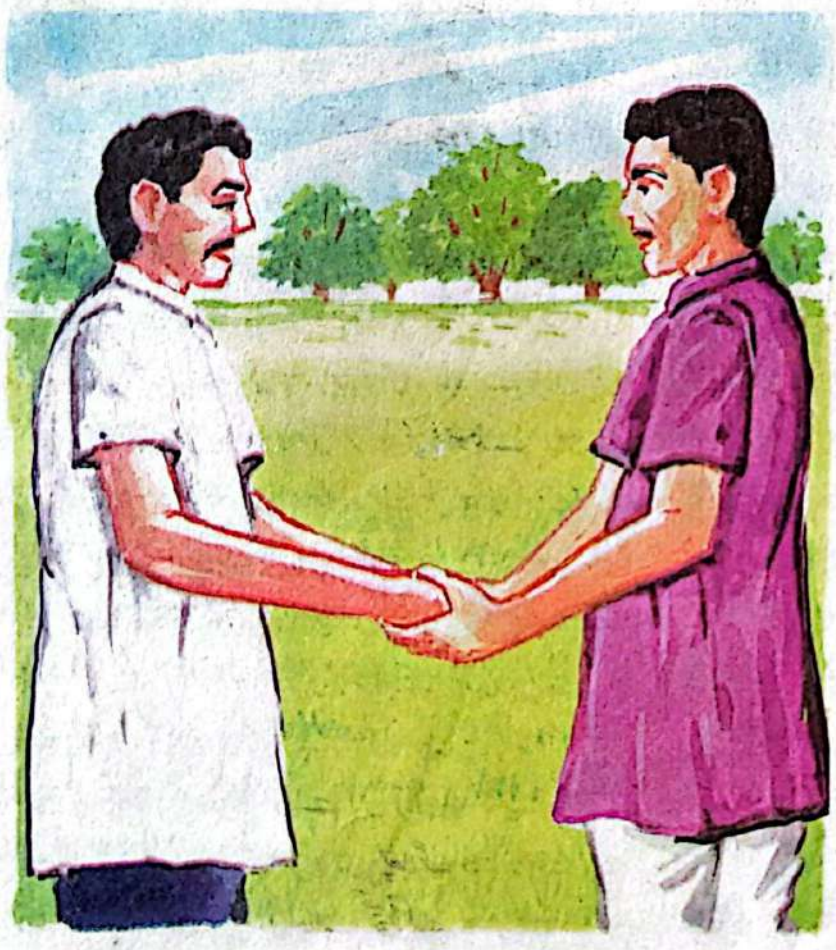

شوکت کی دھنسی ہوئی آنکھوں سے آنسو نکل کر اُس کے فاقہ زدہ پچکے ہوئے گالوں پر بہہ نکلے۔ رحمت کو یہ سب جان کر بہت دُکھ ہوا تھا۔

"آپ کے مرنے سے آپ کو یا آپ کے گھر والوں کو کیا فائدہ ہو گا۔ آپ کے گھر والوں کے مسائل حل تو نہیں ہوں گے بلکہ اور بڑھ جائیں گے۔ آپ کے بعد آپ کے گھر والوں کو کون کما کر دے گا؟ آپ کے گھر والے دربدر ہو جائیں گے۔"

"اب میں زندہ ہوں تو کون سا انہیں کما کر دے رہا ہوں۔"

"اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو ایسی مصیبتوں کے ذریعے آزماتا ہے۔ یہ مصیبت وقتی ہے، لیکن اس مصیبت سے چھٹکارے کا حل خودکشی ہرگز نہیں ہے۔ کیا یہ سوچا ہے آپ نے کہ خودکشی کر کے آپ اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ کی ناراضی مول لیں گے اور خود کو جہنم کا ایندھن بنا ڈالیں گے۔ آپ اپنے گھر والوں کا واحد سہارا ہیں۔ جن بچوں کے سر پر باپ کا سایہ نہ ہو اور جن گھروں میں تحفظ کے لئے کوئی مرد نہ ہو آپ نے سوچا ہے کہ معاشرہ اُن کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا ہے؟"

رحمت بولتا جا رہا تھا اور شوکت کے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

شوکت نے آنسو پونچھتے ہوئے بے بسی سے کہا تو رحمت نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر 200 روپے نکالے۔ کل اُسے

مزدوری کے پیشگی 500 روپے ملے تھے۔ جن میں سے 300اس کی ماں نے گھر کا خرچ چلانے کے لیے رکھ لیے تھے اور باقی 200رحمت کے پاس ہی رہنے دیئے تھے اور کہا تھا۔

"بیٹا! ان 200 روپوں سے اپنے لئے کوئی سستا سا سوٹ خرید لینا۔ تمہارے پاس ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے۔ سارے کپڑے تمہیں چھوٹے ہو گئے ہیں اور بہت پرانے بھی....."

"لیکن اماں ان پیسوں سے میں آپ کے لیے کپڑے لوں گا۔ آپ بھی تو پھٹے پرانے کپڑے پہنتی ہیں۔"

رحمت کی یہ بات سن کر ماں نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس دی تھیں۔

"بھلا مجھے کہاں جانا ہوتا ہے جو میں نئے کپڑے خریدوں، میں تو گھر میں ہی رہتی ہوں۔"

"لیکن اماں....."

"بس میں نے کہہ دیا ہے۔ کل ان پیسوں سے اپنے لیے کوئی سوٹ لے آنا۔"

نیا سوٹ کسی کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہ سوچتے ہوئے رحمت نے وہ پیسے شوکت کی جانب بڑھا دیئے۔

شوکت نفی میں سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹا تھا۔ پیسے نیچے گر گئے۔

"تم رکھو..... یہ تمہارے پیسے ہیں۔"

"مجھے ان پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس اور بھی ہیں۔ یہ آپ اپنے بیٹے کی دوا کے لیے رکھ لیں۔ اور جہاں تک مزدوری کی بات ہے تو چودھری صاحب کی حویلی کا کچھ حصہ بارشوں کی وجہ سے گر گیا ہے۔ ٹھیکیدار نے مجھ سمیت دو اور مزدوروں کو کام پر لگایا ہے۔ 500 روپے پیشگی دیئے ہیں۔ ٹھیکیدار کو کچھ اور مزدوروں کی بھی ضرورت ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں وہ آپ کو بھی کام پر رکھ لے گا، لیکن پہلے ان پیسوں سے دوا خرید لیں۔"

"تم..... تمہارے گھر والوں کو بھی تو پیسے چاہیے ہوں گے۔ میں خود غرض نہیں ہوں۔اگر ہوتا تو خود کشی کی جگہ ڈاکے مارنے کا سوچتا۔" شوکت نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"پیشگی مزدوری میں ملنے والے 500 روپوں میں سے بقایا 300 روپے میرے پاس گھر میں ہیں۔ رحمت سے یہ سن کر کہ ٹھیکیدار کو مزدوروں کی ضرورت ہے۔ اس کے دل کو حوصلہ ملا تھا۔ اُس کے اندر جینے کی نئی اُمنگ پیدا ہو گئی تھی۔

"پتا ہے آپ کو دیکھ کر مجھے مغل بادشاہ اورنگ زیب کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ہمارے ماسٹر جی سنایا کرتے تھے۔ آپ کہیں تو سناؤں۔"

رحمت نے یہ کہتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے شوکت کی جانب دیکھا تو اُس نے سر ہلا کر گویا اجازت دے دی۔

"اورنگزیب عالمگیر بہت نیک اور پرہیز گار بادشاہ تھے۔ وہ بادشاہ ہونے کے باوجود شاہی خزانے یا رعایا کے پیسوں میں سے ایک بھی پیسہ خود پر خرچ نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ وہ قرآن مجید کی خطاطی کرتے تھے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سے اپنا اور گھر والوں کا پیٹ بھرتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا وہ اپنا ہر کام خود کیا کرتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ انہوں نے ایک ضرورت مند کو باورچی رکھ لیا۔ وہ شخص شاہی باورچی کا عہدہ پا کر بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا کہ میں شاہی باورچی بن رہا ہوں۔ یہاں طرح طرح کے کھانے پکیں گے۔ میرے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔

پہلے روز باورچی نے پوچھا۔ "عالی جاہ! آج کیا پکاؤں؟" بادشاہ اورنگزیب نے کہا۔

"کھچڑی پکالو۔"

اگلے روز پھر دریافت کیا کہ "عالی جاہ! آج کیا تناول فرمائیں گے۔"اورنگزیب کی طرف سے جواب ملا ۔ "کھچڑی۔"

باورچی نے سوچا کہ چلو کل یقیناً کچھ نیا پکے گا، لیکن مزید کچھ روز یہی سلسلہ چلتا رہا۔ آخر ایک روز جب باورچی کے پوچھنے پر بادشاہ سلامت نے حسبِ معمول "کھچڑی" کہا تو

باورچی بادشاہ سلامت کے سامنے رو دیا۔

بادشاہ نے رونے کی وجہ پوچھی تو باورچی نے روتے ہوئے کہا۔

"عالی جاہ! جب میں یہاں نوکر ہوا تھا تو میں نے سوچا کہ ہر روز آپ نت نئے شاہانہ کھانے پکانے کا حکم صادر فرمائیں گے۔ میری بیٹی کی شادی ہے۔ میں نے سوچا کہ کھانے پکانے کے لئے جو پیسے آپ دیں گے۔ اُن میں سے بے ایمانی کر کے کچھ پیسے خود رکھ لیا کروں گا اور اِس طرح بیٹی کی شادی کے لئے کچھ پیسے جمع کر لوں گا، لیکن آپ تو کھچڑی سے ہٹ کر کچھ اور پکواتے ہی نہیں۔"

اِس پر شہنشاہ اورنگزیب نے باورچی سے کہا۔

"تم کھچڑی کچھ زیادہ پکالو اور امراء اور درباریوں کے گھر دے آؤ۔ اُن سے کہنا کہ بادشاہ سلامت نے آپ کے لیے کھچڑی بھیجی ہے۔ جب وہ یہ کھچڑی لیں گے تو جیسا کہ روایت ہوتی ہے وہ پلیٹ تمہیں خالی واپس نہیں لوٹائیں گے بلکہ بدلے میں میرے لیے تحائف وغیرہ رکھ کر واپس کریں گے۔ وہ تحائف تم رکھ لینا۔"

اِس پر باورچی نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ کے کہنے کے مطابق سب اس خیال سے کہ یہ کھچڑی بادشاہ سلامت نے تحفتاً بھجوائی ہے۔ انہیں بدلے میں قیمتی اور بیش بہا تحائف دینے چاہیں۔ پلیٹ کو جواہرات اور نادر قیمتی تحائف سے بھر کر باورچی کو واپس کرتے رہے۔ باورچی نے وہ تمام تحائف جمع کر لیے اور پھر بادشاہ کو دکھائے۔ بادشاہ نے کہا۔

"یہ سب تحائف تم رکھ لو۔ تم ناجائز طریقے سے کبھی بھی اتنی دولت جمع نہیں کر سکتے تھے۔ جتنی تم نے جائز اور حق راستے پر چل کر حاصل کر لی ہے۔ یہ پیسے حرام بھی نہیں ہیں اور تم ان سے اپنی بیٹی کی شادی بہت زیادہ دھوم دھام سے کر سکتے ہو۔"

باورچی نے وہ تحائف رکھ لئے اور اپنی بیٹی کی شادی بہت دھوم دھام سے کی۔ امراء سے ملی دولت اتنی زیادہ تھی کہ باورچی خود بھی بہت امیر ہو گیا۔

غلط راستوں پر چل کر یا خلافِ اسلام کوئی کام کر کے

صرف گمراہی مقدر بنتی ہے، فلاح یا کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمیں اسلام کے متعین کردہ راستے کی پیروی کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے کبھی بھی نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ مایوسی کفر ہے۔ ہمیں ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔"

رحمت نے اتنا کہنے کے بعد افسردہ سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے خاموش کھڑے شوکت کو دیکھا۔

"تم بہت اچھے مقرر ہو۔" شوکت نے کہا تو رحمت مسکرا دیا۔

"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟" شوکت نے پوچھا۔

"مڈل کلاس تک پڑھا ہوں، پھر ابا کا انتقال ہو گیا تو میں ان کی طرح مزدوری پر لگ گیا۔"

"میں نے فرسٹ ایئر تک تعلیم حاصل کی ہے۔" شوکت نے کہا۔ رحمت نے ہاتھ میں پکڑے پیسے ایک بار پھر شوکت کی جانب بڑھا دیئے۔

"اچھا فی الحال یہ پیسے رکھ لیں۔ چاہے قرض سمجھ کر ہی سہی۔ جب آپ کے پاس پیسے ہوں گے تب لوٹا دیجئے گا۔ مجھے واقعی ان پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

اِس کے بعد رحمت نے شوکت کو بازار سے کچھ ضروری راشن دلوایا اور پھر وہ اُسے لے کر ٹھیکیدار کے پاس چلا گیا۔ ٹھیکیدار نے فوراً ہی شوکت کو کام پر رکھ لیا۔

شام کو جب سورج ڈھل رہا تھا تو کام سے گھر جاتے ہوئے رحمت نے شوکت سے پوچھا۔

"بھائی! اب تو آپ کبھی خودکشی کا نہیں سوچیں گے۔"

"نہیں میں اب خودکشی کا کبھی نہیں سوچوں گا۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہونے لگا تھا۔ ایسا گناہ جو میری دُنیا ہی نہیں آخرت بھی برباد کر دیتا، لیکن اللہ نے تمہارے ذریعے مجھے اس گناہ سے بچا لیا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"ارے نہیں بھائی، شکریہ آپ اللہ تعالیٰ کا ادا کریں۔ جس نے مجھے آپ کی مدد کرنے کے لئے ایک وسیلہ بنایا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ میں نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا۔"

باتیں کرتے کرتے وہ دونوں چوراہے پر آگئے تھے۔ یہاں سے اُن دونوں کے راستے جدا ہو جاتے تھے۔ اس لیے وہ ایک دُوسرے کو اللہ حافظ کہہ کر اپنی اپنی راہ ہو لیے۔

رحمت آج خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اتنا خوش تو وہ کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ خوشی اُسے نیک کام کرنے سے حاصل ہوئی تھی۔ اچانک ہی اُسے اماں کا خیال آیا۔ نہ جانے اماں کیا کہیں گی۔ وہ تو سمجھ رہی ہوں گی کہ میں اپنے لیے نئے کپڑے لے کر آؤں گا۔ کہیں اُن سے ڈانٹ نہ پڑ جائے، لیکن میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے۔ جس سے مجھے ڈانٹ پڑے۔

انہی سوچوں میں گم وہ اُونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر میں اندر داخل ہوا تو اماں اس کی منتظر تھیں۔

"السلام علیکم اماں۔"

"وعلیکم السلام، تم کپڑے نہیں لائے؟ پیسے کم تھے کیا؟ مہنگائی بھی تو بہت بڑھتی جا رہی ہے۔" اماں نے خالی ہاتھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے رحمت سے پوچھنے کے ساتھ ساتھ اپنا اندازہ بھی ظاہر کیا تھا۔ اگلے ہی پل رحمت نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ اماں سب کچھ جان کر خاموش تھیں۔

"اماں..... آپ..... آپ ناراض تو نہیں؟ شوکت کی اور اس کے بچوں کی زندگی 200 روپوں سے زیادہ قیمتی تھی۔" رحمت ان کے قدموں میں آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔

اماں نے نظر اٹھائیں۔ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں اور لب مسکرا رہے تھے۔

"اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے، مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نے زندگی سے مایوس ایک شخص کی آنکھوں میں امید کا چراغ روشن کیا ہے۔"

اماں پیار سے کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی صورت خوشی کے جگنو جھلملا رہے تھے۔

---☆☆---

جنگل سے جنگل تک

محمد عارف عثمان (لاہور)

اُس روز جب ہم "دی جنگل" ٹی وی کے اسٹوڈیو سے اپنی نئی مہم پر روانہ ہوئے تو بہار کا موسم اپنے جوبن پر تھا۔ ہمارا آدھا دن سفر میں گزرا تھا۔ افریقہ کے جنگلوں کا وسیع سلسلہ ہماری منزل تھا۔ ان جنگلوں کے پاس پہنچ کر ہمیں بہار کے سارے رنگ نظر آئے۔ جلد ہی ہم ایک جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل کے تمام درخت ہرے ہرے پتوں سے بھر چکے تھے اور بہت خوب صورت دکھائی دے رہے تھے۔ جا بجا کھلے ہوئے رنگ برنگے شوخ پھولوں کا اپنا ہی ایک حسن تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ پھول خوشی سے مسکرا رہے ہوں۔ وقفے وقفے سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی جنگلی جانور بھی نظر آ جاتا تھا۔ جوزف اور سوزانے نے اپنا اپنا کیمرہ سنبھال لیا تھا اور دونوں ریکارڈنگ میں مصروف ہو گئے تھے۔

"واہ کیا خوب صورت منظر ہے؟" سوزانے خوشی سے بولی۔

"واقعی..... ہمارے سامنے بہت ہی پیارا منظر ہے۔" مائیکل بھی خاموش نہ رہ سکا۔

اسی دوران اچانک ہمارے سامنے کے درختوں میں سے ایک ننھا منا ہرن بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ ہماری گاڑی سے کچھ دُور رک کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ بہت خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً کوئی جنگلی درندہ اُس کا پیچھا کر رہا تھا۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بھیڑیئے نے ہرن پر چھلانگ لگا دی۔ ہرن خود کو بچانے کے لیے زمین سے چپک گیا۔ بھیڑیا اُس کے اُوپر سے گزرتا ہوا دو تین فٹ آگے جا کر گرا۔ ہرن نے فوراً درختوں کے جھنڈ کی طرف دوڑ لگا دی۔

بھیڑیا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اُس کے بھاگنے کی رفتار ہرن سے کہیں زیادہ تھی۔ قریب تھا کہ وہ ہرن پر جھپٹ پڑتا، ہرن اُسے دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ہرن مڑا اور پلٹ کر پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ اب اُس کا رخ ہماری گاڑی کی طرف تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے ہرن کبھی دائیں مڑتا تو کبھی بائیں۔ بھیڑیا بھی اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہرن کئی بار بھیڑیئے کی زد میں آتے آتے بچا تھا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ آخر کار بھیڑیا ہرن کو قابو کر ہی لے گا۔ ہم سب ہرن اور بھیڑیئے کی آنکھ مچولی دیکھنے میں مصروف تھے۔ اس دلچسپ

منظر کی ریکارڈنگ کے لیے جوزف اور سوزانے گاڑی سے نیچے اتر آئے تھے۔ رفتہ رفتہ ہم سب بھی گاڑی سے اُتر آئے۔

ہرن اور بھیڑیئے کی کشمکش جاری تھی۔ وہ ہم سے بالکل بے خبر تھے۔ گاڑی سے کچھ دُور ہرن نے ایک بار پھر پینترا بدلا اور بھیڑیئے سے بچنے کی کوشش کی۔ بھیڑیا ہرن کی چالاکی کو سمجھ چکا تھا۔ جونہی ہرن نے پینترا بدلا بھیڑیئے نے جھپٹ کر اُس کی ٹانگ اپنے منہ میں لے لی۔ ہم سمجھے کہ ہرن بھیڑیئے کی گرفت میں آچکا ہے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ ہرن نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ گھسٹتا ہوا جیسے تیسے بھاگنے کی تگ ودو کرتا رہا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اُس کی ٹانگ بھیڑیئے کے منہ سے نکل گئی اور وہ چھلانگ لگا کر قریبی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا اور بھیڑیا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اپنے شکار کے فرار ہونے پر بھیڑیئے کی بے بسی دیکھنے والی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں جھانکتے ہوئے غصے سے غرا رہا تھا۔ میں نے نظریں اٹھائیں۔ درختوں پر بیٹھی ہوئیں رنگ برنگی چڑیاں، طوطے اور کوے وغیرہ ہلکا ہلکا شور مچاتے ہوئے حیرت سے بھیڑیئے کو دیکھ رہے تھے۔

ہم بھیڑیئے کو اُس کے حال پر چھوڑ کر گاڑی کی طرف بڑھے۔

"اچھا ہی ہوا کہ ہرن بھیڑیئے کا شکار بننے سے بچ گیا۔" جوزف نے کہا۔

"ہرن چھوٹا تھا، مگر تھا بہت پھرتیلا اور ہوشیار۔" رِیٹا نے تبصرہ کیا۔

"ویسے اس چھوٹے سے واقعے کی فلم بہت اچھی بن گئی ہے۔" سوزانے پلٹ کر بھیڑیئے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور بھیڑیئے کو دیکھے جارہی تھی۔

"سر! وہ دیکھیے۔" مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر سوزانے نے بھیڑیئے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہے سوزانے؟" میں نے بھیڑیئے کی طرف نظریں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"سر! بھیڑیا ایک دم خاموش ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔" اُس نے کہا۔

بھیڑیا واقعی خاموش تھا۔ مجھے وہ کچھ سہما ہوا بھی لگ رہا تھا۔ میں رک گیا۔ مجھے دیکھ کر میرے ساتھی بھی رک گئے۔

"میرا خیال ہے کہ جھاڑیوں میں کوئی خطرناک جانور موجود ہے جسے دیکھ کر بھیڑیا ڈر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ میری بات سنتے ہی جوزف اور سوزانے نے کیمرے آنکھوں سے لگا لیے۔ جھاڑیاں ہلنے لگی تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز جھاڑیوں کے اندر حرکت کررہی ہے۔ بھیڑیا اب آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

"جھاڑیوں میں ایسی کون سی چیز ہے جس نے بھیڑیئے کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا ہے؟" مائیکل نے سوال کیا۔

"دیکھتے جاؤ، ابھی پتہ چل جائے گا۔" میں نے کہا۔

اگلے ہی لمحے ہمیں جھاڑیوں سے بادامی رنگ کا ایک موٹا اور لمبا اژدھا نکلتا دکھائی دیا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا اژدھا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ! اتنا بڑا اژدھا....." رِیٹا بڑبڑائی۔

بھیڑیا اژدھے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر بھاگنے کے لیے مڑا مگر اژدھے نے اُسے بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ اژدھا آناً فاناً لپکا اور اُس نے اپنا بڑا سا غار نما منہ کھول کر بھیڑیئے کا پورا سر اپنے منہ میں دبوچ لیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑیئے کا سر اژدھے کے منہ میں غائب ہو چکا تھا۔ بھیڑیئے کا جسم پھڑک رہا تھا اور ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ وہ اب بھی اپنی جان بچانے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا، لیکن اژدھا اُس سے بہت زیادہ طاقتور تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بھیڑیئے کو نگل رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں آدھا بھیڑیا اژدھے کے منہ میں جا چکا تھا۔ بھیڑیئے کی وجہ سے اژدھے کا جسم پھولتا جارہا تھا۔

"اُف میرے خدا۔" سوزانے خوفزدہ آواز میں بولی۔

"کیسا خوفناک منظر ہے۔" جوزف کی آواز میں بھی خوف غالب تھا۔ ایسی ہی ڈری ڈری سی آوازیں مجھے مائیکل اور رِیٹا کی بھی سنائی دی تھیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے خود مجھے بھی اس منظر نے حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں وہاں صرف اژدھا نظر آرہا تھا۔ بھیڑیئے کا کہیں

نام و نشان نہ تھا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اژدھے نے زندہ بھیڑیا نگل لیا تھا۔ بھیڑیئے کو ہڑپ کرنے کے بعد اژدھا اطمینان سے دوبارہ جھاڑیوں میں گھس گیا۔

"بھیڑیا ہرن کو شکار کرنے آیا تھا مگر خود شکار ہو گیا۔ یقیناً موت اُسے یہاں کھینچ لائی تھی۔"

یہ سوچتے ہوئے میں گاڑی کی طرف بڑھا۔ سوزانے، جوزف، ریٹا اور مائیکل بھی میرے پیچھے پیچھے تھے۔ ہم آگے روانہ ہو گئے۔

بعض جگہوں پر جنگل کافی گھنا تھا۔ کہیں کہیں لومڑیاں اور اِکا دُکا دُوسرے جنگلی جانور نظر آ جاتے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ایک دلچسپ منظر ہمارے سامنے آیا۔ ہم نے تین جنگلی بھینسوں کو اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ شاید کوئی درندہ ان بھینسوں کا پیچھا کر رہا ہے، لیکن جلد ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ دو بندر ان بھینسوں کو تنگ کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے ہم سب گاڑی سے اتر آئے۔ بندر کبھی ان کی کمر پر بیٹھتے تو کبھی اُن کے سر پر سوار ہو جاتے۔ کبھی شرارتاً دانتوں سے کاٹتے، کبھی اُن کی دُم پکڑ کر کھینچتے اور کبھی اُن کے سامنے آ کر منہ بگاڑتے اور عجیب عجیب شکلیں بناتے۔ بھینسیں جب اُن کے پیچھے بھاگتیں تو وہ فوراً تیزی سے اچھل کر درختوں پر چڑھ جاتے۔ بھینسوں کا غصہ بجا تھا مگر وہ بیچاری بے بس تھیں۔ بار بار کی کوشش کے باوجود بھی بندر اُن کے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ بھینسوں کے تیور دیکھ کر لگتا تھا کہ اگر بندر اُن کے ہاتھ لگ گئے تو وہ اُن کا قیمہ بنا کر رکھ دیں گی۔ جوزف اور سوزانے یہ منظر ریکارڈ کرتے ہوئے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ بھینسیں تھک ہار کر بیٹھتیں تو بندر انہیں پھر بھی چین نہ لینے دیتے بلکہ اُن کی شرارتوں میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ کھیل کافی دیر تک جاری رہا اور ہم ہنستے رہے۔ جب بھینسوں کا بس نہ چلا تو وہ تنگ آ کر ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئیں۔ بھینسوں کو کھلے میدان کی طرف جاتے دیکھ کر بندروں نے بھی اُن کا پیچھا چھوڑ دیا اور درختوں پر چھلانگیں لگاتے ہوئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

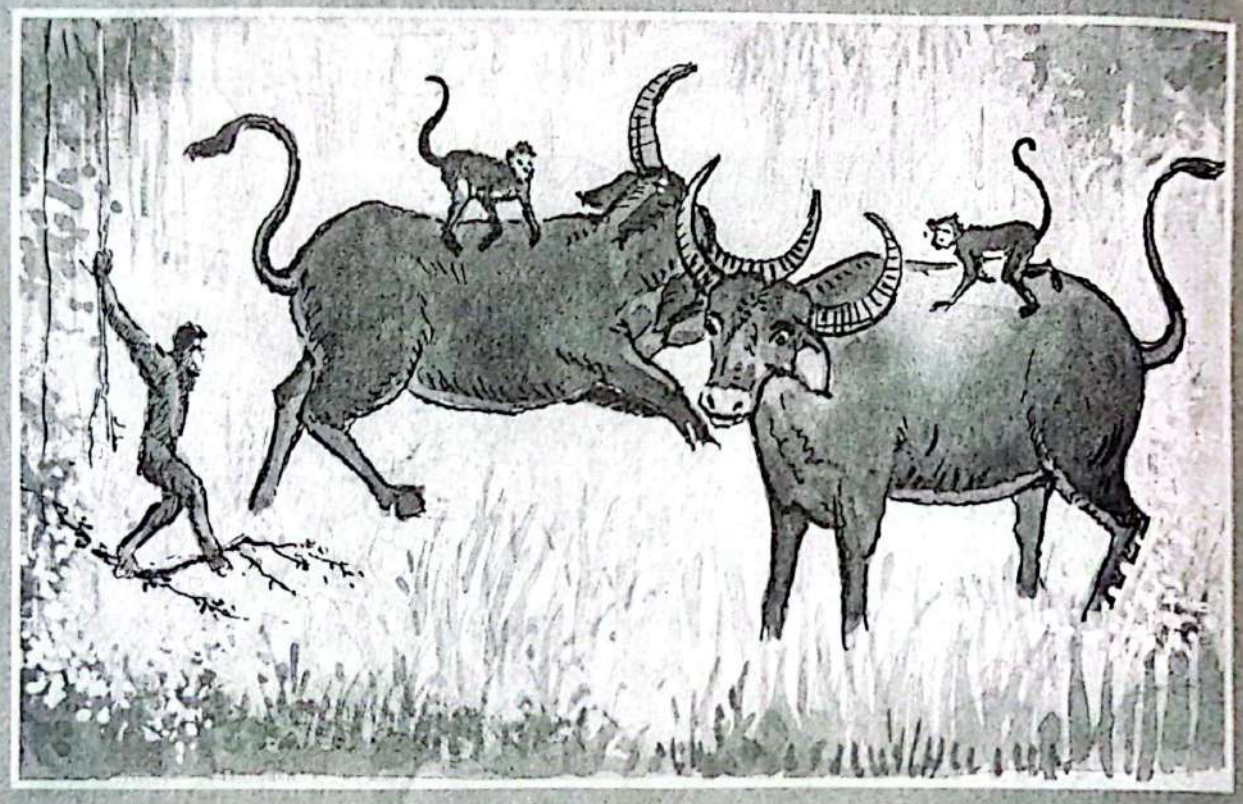

پھر ہم آگے روانہ ہو گئے۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ دھوپ کا رنگ زردی مائل ہوتا جا رہا تھا۔ درختوں، جھاڑیوں، گھاس اور پھول دار پودوں پر پڑتی ہوئی اس زرد دھوپ نے جنگل کی

خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ دھوپ کے رنگ نے جنگل کے رنگوں سے مل کر ماحول کو سحر انگیز بنا دیا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ دُور دُور تک پھیلا ہوا یہ پیارا پیارا دلکش منظر آنکھوں میں سما جائے۔ میں نے جنگل سے لطف اندوز ہونے کے لیے گاڑی روک دی۔ جوزف اور سوزانے گاڑی سے اتر کر اس منظر کو کیمرے میں محفوظ کرنے لگے۔ مجھے ایک طرف سٹرابری کے درختوں کی ایک لمبی قطار نظر آئی۔ تمام کے تمام درخت سرخ سرخ سٹرابری سے لدے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے ساتھ ہی پانی کا پچاس ساٹھ میٹر چوڑا ایک تالاب بھی دکھائی دے رہا تھا۔ رس بھری سٹرابری دیکھ کر ہم سب کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ مائیکل اور رِیٹا بھاگے ہوئے گئے اور سٹرابری کے درختوں سے سٹرابری توڑنے لگے۔ جنگل کا نظارہ کرتے ہوئے میں نے ایک نظر مائیکل اور رِیٹا پر ڈالی۔ اُن کے ہاتھوں میں سٹرابری کے کئی گچھے تھے اور وہ تالاب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سٹرابری دھونے کے لیے تالاب کی طرف جا رہے ہیں۔ میں دوبارہ جنگل کے نظاروں میں کھو گیا۔

اچانک درد ناک چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے فوراً مائیکل اور رِیٹا کی طرف دیکھا۔ میرا اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ایک مگر مچھ نے رِیٹا کی ٹانگ اپنے جبڑوں میں جکڑ رکھی تھی اور وہ رِیٹا کو تالاب میں کھینچ رہا تھا۔ مائیکل نے رِیٹا کا بازو پکڑا ہوا تھا اور وہ اُسے اپنی طرف کھینچنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ رِیٹا تکلیف اور خوف کے مارے چیخ و پکار کر رہی تھی۔ میں اپنی گن سنبھالے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تالاب کی طرف دوڑ پڑا۔ میری نظریں مسلسل رِیٹا اور مگرمچھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مائیکل رِیٹا کو مگرمچھ سے چھڑانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں وہ دونوں زمین پر گر چکے تھے۔ اب مگر مچھ آسانی سے رِیٹا کو تالاب میں گھسیٹ رہا تھا۔ مائیکل کسی سہارے کی تلاش میں تھا۔ وہ بار بار گھاس کو پکڑتا، لیکن مگرمچھ کے زور کے سبب گھاس ٹوٹتی اور مائیکل تالاب کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس حالت میں رِیٹا کی چیخیں دل دہلا رہی تھیں۔ اسی اثناء میں جوزف بھی وہاں پہنچ

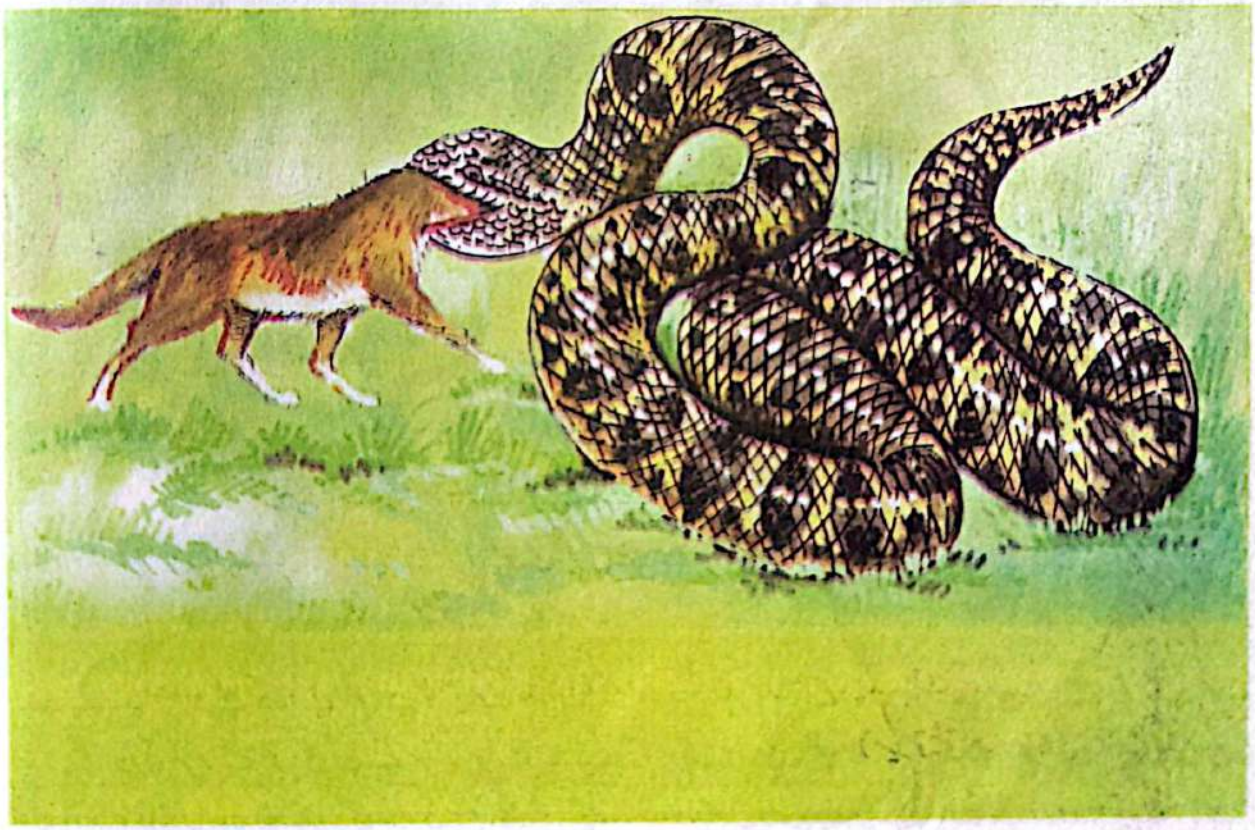

چکا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر مائیکل پر گرا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ میں نے تالاب کے کنارے پر کھڑے ہو کر مگر مچھ کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ مگر مچھ کو گولی لگتے ہی ریٹا اُس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ مگر مچھ کے تڑپنے کی وجہ سے تالاب میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور تالاب کا پانی مگر مچھ کے خون سے سرخ ہونے لگا۔ تالاب میں مجھے کئی مگر مچھ تیرتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ کچھ دیر بعد مگر مچھ کی لاش تالاب میں تیر رہی تھی۔ میں ریٹا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُس کی ٹانگ شدید زخمی تھی اور اُس پر مگر مچھ کے دانتوں کے کئی نشان تھے۔

ہم اسے سہارا دے کر گاڑی میں لائے اور اُس کے زخموں پر دوا لگا کر مرہم پٹی کر دی۔ ریٹا جلد ہی سنبھل گئی۔ اب شام ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا آٹھ دس بھینسیں پانی پینے کے لیے تالاب کی طرف جا رہی تھیں۔

"سوزانے، جوزف! تیار ہو جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے میں تالاب کی طرف چل پڑا۔ سوزانے اور جوزف بھی میرے ساتھ تھے۔ میں نے مائیکل کو ریٹا کے پاس رکنے کے لیے کہا۔

ہم تالاب کے قریب پہنچ کر درختوں کے پیچھے چھپ گئے۔ بھینسیں اطمینان سے پانی پینے میں مصروف تھیں کہ میری توقع کے عین مطابق یکا یک مگر مچھوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ بھینسوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ بھینسیں تو بھاگنے میں کام یاب ہو گئیں، لیکن مگر مچھوں نے دو بھینسوں کو قابو کر لیا تھا۔ ایک بھینس تھوڑی سی جدوجہد سے مگر مچھوں کے شکنجے سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ دُوسری بھینس کو مگر مچھوں نے گرا لیا اور گھسیٹتے ہوئے تالاب میں لے گئے۔ تالاب میں ایک بار پھر زلزلہ سا آ گیا۔ بھینس کے تالاب میں پہنچتے ہی کئی مگر مچھ اپنا اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے اُس پر جھپٹ پڑے۔ ذرا سی دیر میں تالاب میں بھینس کے اعضا لوتھڑوں کی شکل میں بکھرے پڑے تھے۔ جوزف اور سوزانے نے یہ سارا منظر مختلف زاویوں سے کیمرے میں محفوظ کر لیا تھا۔ جب تالاب کا پانی پُر سکون ہو گیا تو ہم گاڑی کی طرف چل پڑے تاکہ "دی جنگل" ٹی وی اسٹیشن کی طرف واپس روانہ ہو سکیں۔

---☆☆---

خوش کلامی

ایک سبزی فروش شخص نہایت خوش اخلاق تھا۔ اُس کی ساری سبزی دیکھتے ہی دیکھتے بک جاتی تھی۔ اُس کے حاسدوں نے اُسے اتنا تنگ کیا کہ اُس کی خوش اخلاقی اور شیریں بیانی بداخلاقی میں بدل گئی۔ اب جو گاہک بھی آتا وہ اُس سے لڑنے جھگڑنے لگتا، جس کی وجہ سے اس کے گاہک ختم ہو گئے۔

ایک دن اس نے اپنی بد قسمتی کا گلہ اپنی بیوی سے کیا تو وہ بولی۔

"قسمت کو کیوں کوستے ہو، تمہاری خوش اخلاقی اور زبان میں فرق آ گیا ہے۔ پہلے تم اپنی شیریں بیانی سے لوگوں کے دل موہ لیتے تھے اور لوگ سبزی خریدنے تمہاری طرف دوڑے چلے آتے تھے۔ اب تمہاری تلخ کلامی اور طنزیہ جملوں نے لوگوں کو تم سے دُور کر دیا ہے۔ اپنی تجارت میں برکت چاہتے ہو تو پہلے کی طرح میٹھے لہجے اور اچھے اخلاق کا سہارا لو، تمہاری خوش قسمتی خود تمہارے پاس لوٹ آئے گی۔"

"اُس آدمی نے ایسا ہی کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس کا کاروبار پہلے کی طرح خوب چمک اٹھا۔

(سید توشیق حیدر ترمذی، جھنگ صدر)

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن مجید کی کس سورۃ کو قرآن کا دل کہا جاتا ہے؟

i۔ سورۃ فاتحہ ii۔ سورۃ یٰسٓ iii۔ سورۃ الکوثر

2۔ "یارِ غار" کس جلیل القدر خلیفہ راشد کو کہا جاتا ہے؟

i۔ حضرت عمر فاروقؓ ii۔ حضرت عثمان غنیؓ iii۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ

3۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کون سا لقب عطا ہوا؟

i۔ ذبیح اللہ ii۔ خلیل اللہ iii۔ کلیم اللہ

4۔ حضورؐ نے کس عمل کو "عبادت کا مغز" قرار دیا ہے؟

i۔ تلاوت ii۔ دُعا iii۔ درود

5۔ انسانی جسم میں کتنے دن کے بعد پرانے خون کی جگہ نیا خون بن جاتا ہے؟

i۔ 70 دن بعد ii۔ 100 دن بعد iii۔ 110 دن بعد

6۔ کرونو میٹر سے کون سی چیز ماپی جاتی ہے؟

i۔ وقت ii۔ ہوا کا دباؤ iii۔ پانی

7۔ سند باد جہازی کس ممتاز ادیب کا قلمی نام ہے؟

i۔ اشفاق احمد ii۔ چراغ حسن حسرت iii۔ احمد ندیم قاسمی

8۔ کس درے کو پاکستان کا دروازہ کہا جاتا ہے؟

i۔ خیبر ii۔ بولان iii۔ بابو سر

9۔ وہ کون سا ملک ہے جس میں سانپ نہیں پائے جاتے؟

i۔ امریکہ ii۔ روس iii۔ نیوزی لینڈ

10۔ ناول "خاک اور خون" کے مصنف کا نام کیا ہے؟

i۔ عبداللہ حسین ii۔ نسیم حجازی iii۔ ڈپٹی نذیر احمد

جوابات علمی آزمائش اپریل 2010ء

1۔ عروس القرآن 2۔ حضرت بلالؓ 3۔ تیر 4۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ 5۔ لیرا 6۔ یونان 7۔ برطانیہ 8۔ ہری پور ہزارہ 9۔ ابن صفی۔ 10۔ سو

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد عمر بن شہزاد، پشاور (200روپے کی کتب)

☆ عمارہ منیر، اسلام آباد (175روپے کی کتب)

☆ دانیا خان، ہری پور ہزارہ (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: واجد نگینوی کراچی۔ حسن رضا سردار کامونکی۔ سارہ کفیل واہ کینٹ۔ عمارہ حسن، نور العین، رامش خان، شہیر احمد خان، عائشہ نوید، ماریہ بنت طارق، محمد ذیشان قمر، صہیب راول پنڈی۔ عرفان خضر عباس گجرات۔ عروہ عاطف، عائشہ عظیم، محمد آدم اشفاق، محمد حمزہ سعید، عبدالرحمٰن، آمنہ ظفر، عبداللہ خلیل، محمد سلیمان غنی، ضحیٰ شاہد لاہور۔ محمد عمیر، شیخ محمد مبشر، ثانیہ ارشد رحیم یار خان۔ شہزاد علی پاکپتن۔ حبیب اللہ بلوچ، صفورہ اصغی، ربیعہ اقبال، مدثرہ خلیل دینہ۔ ثانیہ طلعت سیال کوٹ۔ سعید غازی، ایمن اعجاز، قمر ناز دہلوی، سیدہ نادیہ یاسمین، بینش ظریف کراچی۔ صبا فاطمہ جھنگ۔ تحریم حبیب گوجر خان۔ صباحت، رمشا گجرات۔ محمد آصف روانہ سرگودھا۔ عکاشہ احمد مغل گجرات۔ عادل محمود سیال کوٹ۔ نمرہ شاہین خوشاب۔ زہرا خالد سرگودھا۔ فرح اسلام کراچی۔ ہارون الرشید جہلم۔ مرزا شہیر بیگ ملتان۔ احسن ایاز صوابی۔ اقراء شمس ڈیرہ اسماعیل۔ حافظ محمد ارقم گوجرانوالہ۔ جویریہ نعیم، وجیہہ نعیم صوابی۔ مروہ شاہد سیال کوٹ۔ محمد عبداللہ خان، دامن زہرا، محمد سعد الاسلام، حمیرا محمود اسلام آباد۔ سید خضر ابراہیم ایبٹ آباد۔ عائشہ صدیقہ اوکاڑا۔ فائزہ عبداللہ گوجرانوالہ۔ عباس، شہزاد محسن کوہاٹ۔ علینہ شوکت، حافظہ سیرت فاطمہ، اقصیٰ منیر فیصل آباد۔ تنزیلہ اسلم مہلووالہ۔ محمد عمر اشرف وہاڑی۔ حسن مجتبیٰ کھاریاں۔ رشید احمد کشمور۔ بشریٰ مجتبیٰ تربیلا ڈیم۔ عامر سلطان کرک۔ احمد اعجاز حیدر آباد۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی 2010ء

دماغ لڑاؤ

نام: _____

مقام: _____

پتا: _____

_____

بندگی

علی اکمل تصور (قصور)

گوشی اپنے لمس سے قیوم کو ہمیشہ یہ احساس دلانے میں کامیاب رہتی تھی کہ وہ اُس کے لیے کتنا محترم ہے۔ وہ اُس سے کتنا پیار کرتی ہے اور پیار کے اس احساس سے قیوم کا دل مطمئن ہو جاتا تھا کہ گوشی کو پناہ دے کر اُس نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ وہ سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی رات تھی۔ گھر کے تمام افراد نرم گرم لحافوں میں دبکے نیند کے مزے لے رہے تھے۔ جب اچانک قیوم کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آنکھ کھلنے کی وجہ ایک آواز تھی۔ پہلے تو یہ آواز وقفے وقفے سے آرہی تھی۔ پھر اس آواز میں تیزی آگئی۔ قیوم کے دماغ پر یہ آواز ہتھوڑا بن کر برس رہی تھی۔ فطری طور پر قیوم ایک گرم مزاج اور جلد باز آدمی تھا۔ صبر جیسی خوبی اُس کی فطرت میں موجود ہی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ منفی انداز میں سوچتا تھا۔ وہ ہر انسان پر شک کرتا تھا۔ ہر بات پر شک کرتا تھا۔ زندگی کے ہر معاملے کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا اور آج یہ آواز اسے غصہ دلا رہی تھی۔ وہ لحاف ایک طرف پھینک کر بستر سے باہر نکل آیا۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔ ماحول پر دھند کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی، لیکن دھند کی وجہ سے روشنی کم تھی۔ قیوم گلی میں آگیا۔ فوراً ہی آواز کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔

"میاؤں..... میاؤں..... میاؤں..... میاؤں....."

یہ بلی کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو قیوم کو دیکھ کر شاید مدد کی عرض سے زیادہ شور مچانے لگا تھا۔ قیوم نے دیکھا وہ بچہ اُس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

"میاؤں..... میاؤں....."

قیوم کو ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ جیسے بچہ کہہ رہا ہو۔

"رحم..... رحم....."

قیوم اس ننھے سے بچے کا شور سن کر گھر سے اس لیے باہر نکلا تھا کہ مار کر اس بچے کو بھگا دے گا، لیکن بچے کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ جانے وہ کون سا جذبہ تھا کہ قیوم نے جھک کر بچے کو ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ بچہ اپنی زبان سے قیوم کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ بچہ بھوکا ہے۔ قیوم اُسے اپنے گھر لے آیا۔ باورچی خانے میں اُبلا ہوا دودھ رکھا ہوا تھا۔ جو صبح ناشتے میں کام آنا تھا۔ قیوم نے ایک پیالی میں دودھ لیا اور بچے کے سامنے رکھ دیا۔ بچے کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ یہ دودھ کیسے پیئے۔ قیوم نے بچے کے سر کو

پیالی کی طرف جھکایا۔ جیسے ہی بچے کی زبان دودھ کو لگی۔ اُسے دودھ پینے کا طریقہ سمجھ میں آگیا۔ اب وہ شٹرپ.....؟ شٹرپ" کی آواز کے ساتھ دودھ پی رہا تھا۔ قیوم پاس کھڑا بچے کو دودھ پیتا دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ پیالی میں موجود دودھ ختم ہوا تو بلی کا بچہ قیوم کے قدموں میں آکر لوٹنے لگا۔ وقفے وقفے سے وہ اپنی زبان سے قیوم کے پاؤں چاٹ رہا تھا۔ پیار کا یہ احساس قیوم کو بہت اچھا لگا۔ قیوم نے اس بے سہارا بچے کو پالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس نے بچے کو ایک گرم جگہ پر سونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ پھر وہ اپنے بستر میں چلا آیا۔ اب فضا خاموش تھی۔ بلی کا بچہ اب شور نہیں کر رہا تھا۔

"ابو آپ کہاں گئے تھے؟"

فخر نے اپنے ابو کی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور اب وہ نیند کی حالت میں اپنے ابو سے پوچھ رہا تھا۔

"سو جاؤ بیٹا..... میں تمہارے پاس ہی تھا....."

فخر مطمئن ہو کر دوبارہ سو گیا۔ اگلا دن اپنے ساتھ فخر کے لیے خوشی کا پیغام لے کر آیا۔ اسے کھیلنے کے لیے بلی کا بچہ مل گیا تھا۔ گھر کے افراد اس لیے خوش تھے کہ پہلی بار قیوم نے اپنی فطرت سے ہٹ کر کوئی کام کیا تھا۔ فخر نے بلی کے بچے کو گوشی کا نام دیا تھا۔ گوشی زیادہ تر فخر کے پاس رہتا تھا لیکن اسے قیوم سے انسیت زیادہ تھی۔ وہ جانور تھا لیکن جس نے اُس کے ساتھ احسان کیا تھا اُس کا احترام سب سے زیادہ تھا۔

قیوم شام ڈھلے اپنی دُکان بند کر کے گھر واپس لوٹتا تھا۔ نہ جانے گوشی کو کیسے قیوم کے آنے کی خبر پہلے سے ہو جاتی تھی۔ وہ دروازے کے پاس آجاتی تھی۔ جب تک قیوم گھر میں داخل نہیں ہو جاتا تھا۔ وہ میاؤں..... میاؤں کی آواز کے ساتھ اسے پکارتی رہتی تھی۔ قیوم کو دیکھتے ہی وہ اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔ اپنی زبان سے اُس کے پاؤں چاٹتی تھی۔ قیوم سمجھ جاتا تھا کہ گوشی کو بھوک لگی ہے۔ گوشی اب بڑی ہو گئی تھی۔ دودھ کے علاوہ گوشت کا قیمہ بھی اس کی خوراک تھی جو قیوم گھر لوٹتے ہوئے لے کر آتا تھا۔ مہنگائی کے اس جان لیوا دور میں یہ اضافی خرچ تھا جو قیوم اپنے بیٹے کی خوشی اور ایک جاندار سے ہمدردی میں برداشت کیے جا رہا تھا ورنہ اس کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا۔ اپنا گھر بیچ کر اس نے دُکان بنائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دُکان چل نکلے گی تو وہ دو تین مکانوں کا مالک تو بن ہی جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ زندگی میں انسان بہت سے منصوبے بناتا ہے۔ لیکن ان میں کامیابی کا دارومدار اس کی اپنی محنت اور اللہ کی رضا پر ہوتا ہے۔ تقدیر اور تدبیر کا فلسفہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ تدبیر میں ناکامی پر قیوم پریشان رہنے لگا اس پریشانی نے اس کے مزاج میں غصہ پیدا کر دیا اور غصہ اپنے ساتھ بہت سی خرابیاں لے کر آیا۔ مول تول میں گاہکوں کے اصرار پر وہ بھڑک جاتا تھا۔ ایک بار جو قیوم کی دُکان سے خریداری کرتا تھا وہ دوبارہ نہیں آتا تھا۔ بچت کی بجائے اس کی اصل آمدنی گھریلو اخراجات پر صرف ہو رہی تھی اور قیوم اپنی اور اپنے گھر والوں کے مستقبل کی فکر میں اپنا ذہنی سکون کھو بیٹھا تھا۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ شام ہونے والی تھی۔ سارا دن گزر گیا تھا لیکن کوئی گاہک دُکان پر نہیں آیا تھا۔ آج فخر بھی اپنے ابو کی مدد کے لیے دُکان پر موجود تھا۔ چھٹی کا دن وہ ابو کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔ وہ بھی اپنے وجود میں گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ بازار میں ہجوم تھا۔ لیکن اس ہجوم میں ایسا کوئی نہیں تھا جو ان کے نصیب کا رزق اپنے ساتھ لے کر آتا۔ ایسے میں ایک بزرگ صورت آدمی پاس سے گزرتے ہوئے رُک گیا۔ یہ قیوم کے محلے کی مسجد کے امام صاحب تھے۔

"اُستاد جی! کیسے ہیں آپ؟" قیوم فوراً بولا۔ قیوم نے اپنے بچپن میں قرآن پاک کی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں تم کچھ پریشان لگتے ہو....." استاد جی نے قیوم کے چہرے پر موجود پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ بے دلی سے مسکرایا اور بولا۔

"اُستاد جی! کیا بتاؤں ایک سوال مجھے پریشان کرتا ہے"

"بتاؤ..... شاید میں تمہاری مشکل آسان کر دوں....."

"استاد جی! میں سوچتا ہوں کہ ہم مسلمان ہیں، اللہ تعالیٰ

ی پسندیدہ مخلوق ہیں ہم..... پھر کیوں ہمیں راحت نصیب نہیں ہے۔ کیوں غم، فکر اور پریشانیوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ کیوں آسودگی ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔ دُوسری طرف غیر مسلم زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ بہت سے مسلمان بھی ایسے ہیں جو ایسے کام کرتے ہیں جو اللہ کی نظر میں حرام ہیں۔ پھر بھی وہ خوش حال ہیں اور ہمیں حلال طریقے سے بھی رزق نہیں ملتا۔ کیوں؟ استاد جی ایسا کیوں ہے؟"

قیوم نے ایک ہی سانس میں اپنی جلن اگل دی تھی۔ فخر بے چین ہو گیا تھا۔ وہ نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ اپنے ابو کے اس سوال کا جواب اس کے پاس موجود تھا، لیکن الفاظ موجود نہیں تھے۔ اُستاد جی فوراً ہی سنجیدہ ہو گئے۔ جیسے انہیں کچھ یاد آگیا ہو۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔

"قیوم بیٹے! جب تم چھوٹے تھے تو تمہارے والد صاحب تمہیں میرے پاس لائے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ میں تمہیں قرآن پاک کی تعلیم دوں۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ تین دن کی مسلسل کوشش کے بعد بھی تم ایک چھوٹا سا سبق یاد نہیں کر پائے تھے تو میں نے تمہیں سزا دی تھی اور ساتھ ہی تم سے ایک سوال پوچھا تھا کہ عقل بڑی ہے یا بھینس....."

"اور میں نے جواب دیا تھا کہ بھینس....." قیوم ہنس پڑا۔

"ہنسنے والی بات نہیں ہے....." استاد جی کا لہجہ سخت تھا۔

"پھر تمہارے والد صاحب وفات پا گئے اور تم تعلیم ادھوری چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میں سوچتا تھا کہ زندگی تمہیں بتا دے گی کہ عقل بھینس سے بڑی ہوتی ہے لیکن افسوس آج بھی تمہارے نزدیک بھینس عقل سے بڑی ہے۔ احمق آدمی ہم نام کے مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس ایسا کون سا عمل ہے جو ہم فخر کے ساتھ اللہ کے حضور پیش کر سکیں۔ دُنیا کی زندگی تو ایک آزمائش ہے یہ جاننے کے لیے کہ مومن کون ہے۔ کعبہ کتنا خوش قسمت ہے وہ اللہ کا گھر ہے۔ اور مومن..... مومن تو کعبہ سے بھی زیادہ خوش قسمت ہے کیونکہ اللہ مومن کے دل میں رہتا ہے۔ حق اللہ....."

اُستاد جی پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی لیے وہ دُکان سے باہر نکل گئے۔ قیوم کا سر جھک گیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ فخر کے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

پھر دونوں باپ بیٹا دُکان بند کر کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ گھر کے قریب پہنچے تو اُن کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

"میاؤں..... میاؤں....."

یہ گوشی تھی جو بے تابی کے ساتھ قیوم کی منتظر تھی۔ قیوم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایک جانور کے دل میں اپنے لیے پیار کا یہ احساس قیوم کو بڑا سکون دیتا تھا۔ قیوم دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوا تو گوشی لپک کر قیوم کے پاس چلی آئی۔

"میاؤں..... میاؤں....."

قیوم سمجھ گیا کہ گوشی کو بھوک لگی ہے۔ اُس نے ایک پیالے میں دودھ لیا اور گوشی کے سامنے رکھ دیا۔ گوشی شڑپ..... شڑپ کی آواز کے ساتھ دودھ پینے لگی۔ قیوم مسرور نظروں سے گوشی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ فخر کے چہرے پر موجود چمک نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ فخر کی زبان کو اچانک ہی الفاظ مل گئے تھے۔

"ابو جی! ایک بے زبان جانور آپ کے پاؤں چاٹتا ہے تو آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھوکا ہے۔ اور آپ اس کی بھوک مٹانے کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اگر یہی معاملہ ہم اپنے اللہ کے ساتھ کر لیں تو کیا وہ ہماری بھوک مٹانے کا انتظام نہیں کرے گا۔ وہ تو بڑا مہربان ہے....."

یہ کہتے ہوئے فخر ہچکی لے کر رو پڑا۔ قیوم کا پورا وجود کانپ کر رہ گیا۔ خون پارہ بن کر جسم میں دوڑ رہا تھا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"جواب مل گیا، میرے بچے..... جواب مل گیا....."

"ابو جی!" فخر قیوم سے لپٹ گیا۔ قیوم فخر کے بال سہلا رہا تھا۔ آج ایک بیٹے نے اپنے باپ کو ایمان کا سبق دیا تھا۔ یہ سبق ایک لفظ پر مشتمل تھا۔

"بندگی....."

کام کریں بس کام کریں

محنت سے ہے عظمت بھی
عظمت بھی ہے برکت بھی
محنت صبح و شام کریں
کام کریں بس کام کریں

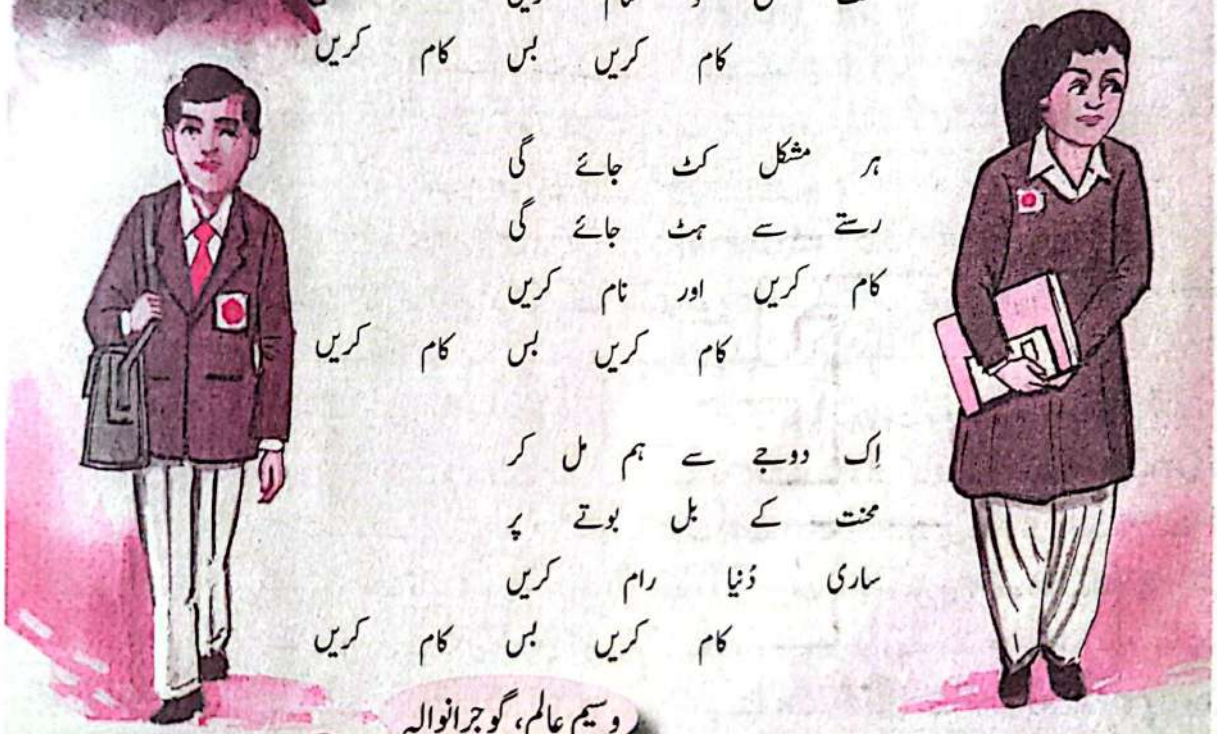

ہر مشکل کٹ جائے گی
رستے سے ہٹ جائے گی
کام کریں اور نام کریں
کام کریں بس کام کریں

اِک دوجے سے ہم مل کر
محنت کے بل بوتے پر
ساری دُنیا رام کریں
کام کریں بس کام کریں

وسیم عالم، گوجرانوالہ

راستہ تلاش کریں

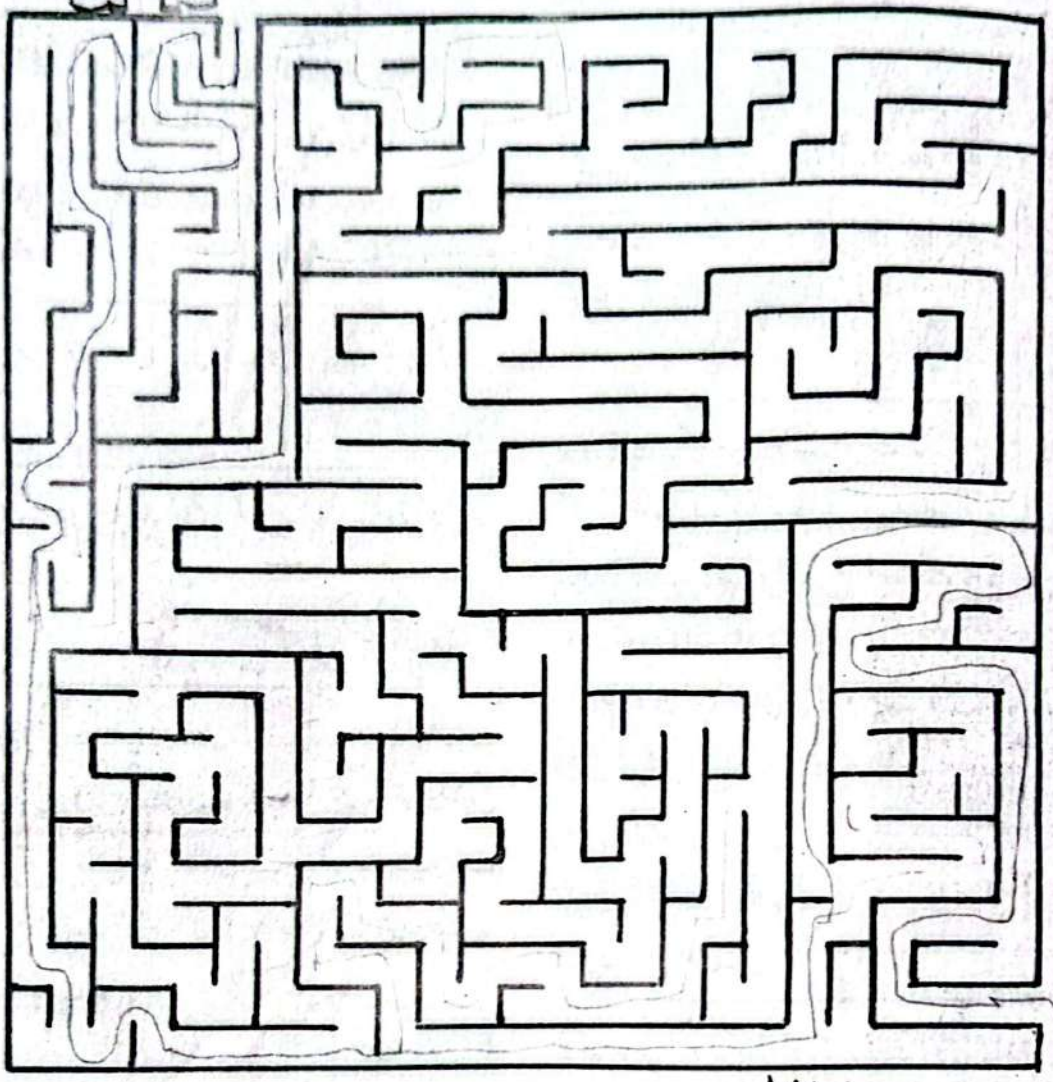

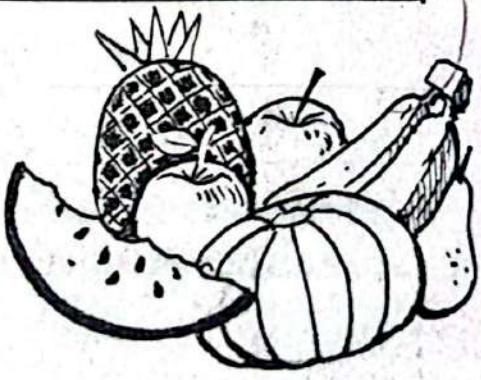

واہ، مزے دار پھل، اب تو پھل کھانے کا مزہ آئے گا۔
لیکن میں ان بھول بھلیوں سے گزر کر پھلوں تک کیسے پہنچوں۔
کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟

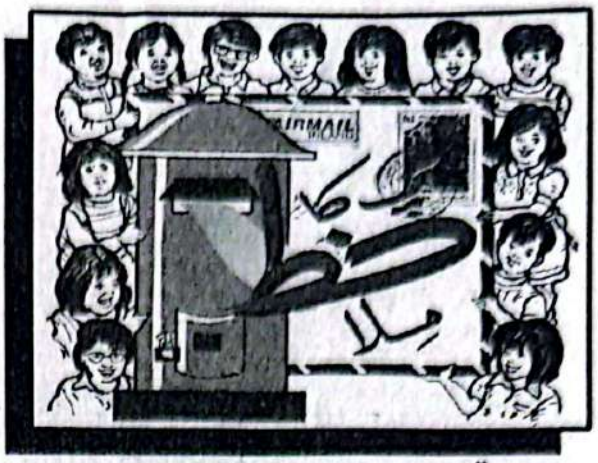

مدیر تعلیم وتربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

مجھے اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا زبردست تھا۔

(محمد ریحان صفدر، ڈی جی خان)

کہانیوں میں سزا، گڑیا گھر اور کہانی ایک خط کی بہت اچھی تھیں۔

(صفورہ اصفی، کراچی)

اپریل کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر کہانیاں کبوتر کہانی اور کا گوڈا دل کو لبھائیں۔

(عمارہ منیر، اسلام آباد)

تعلیم وتربیت اپنی دلچسپ کہانیوں، نظموں، لطائف، معلوماتِ عامہ اور دُنیا میں رونما ہونے والے عجیب وغریب واقعات شائع کرنے میں منفرد مقام رکھتا ہے اس لئے ہر عمر کے بچے، بڑے بہت ذوق وشوق کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مجھے یہ رسالہ بہت پسند ہے۔

(واجد نگینوی، کراچی)

اس بار بھی حسبِ معمول نئے شمارے کا بے چینی سے انتظار تھا جس کے لئے میں نے کئی دفعہ دُکان کا چکر لگایا۔ یہ شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ میری دُعا ہے کہ "تعلیم وتربیت" اسی طرح ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔

(وقاص مصطفیٰ، شورکوٹ)

میں نے جماعت پنجم کا امتحان پاس کیا ہے۔ مجھے تعلیم وتربیت بے حد پسند ہے۔ میں اس میں کہانی لکھنے کی خواہش مند ہوں۔ اپریل کے شمارے میں راز، دادی اماں زندہ ہیں اور انوکھا لباس بہت اچھی تحریریں تھیں۔

(سلمٰی صوبیہ قمر، چارسدہ)

☆ تعلیم وتربیت کے لئے ضرور کہانی لکھیں۔

انکل! اپریل کے شمارے میں تمام کہانیاں عمدہ اور اپنی مثال آپ تھیں۔ مفید مشغلے میں میرا ایک مشغلہ بھی شامل کر دیں، وہ مشغلہ ہے اخباری کارٹون جمع کرنا، میں نے یہ مشغلہ 2008ء میں شروع کیا تھا۔

(سیدہ نادیہ یاسمین، کراچی)

سرورق ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں خصوصاً راز، گڑیا گھر، ہزار روپے، اور انوکھا لباس بہت پسند آئیں۔ میرے پسندیدہ اشعار کا سلسلہ مجھے بہت پسند ہے اور نیا سلسلہ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا ایک زبردست سلسلہ ہے۔ اس بار چچا تیز گام کا انتظار تھا مگر ان کی گاڑی لیٹ ہو گئی۔ دُعا ہے کہ چچا تیز گام کی تیز گام اب کی بار تاخیر کا شکار نہ ہو اور وہ ہمارے ساتھ موجود ہوں۔

(فرح اسلام، کراچی)

☆ لیجئے آپ کی دُعا قبول ہو گئی ہے۔ چچا تیز گام کی تیز گام اس بار لیٹ نہیں ہوئی۔

انوکھا لباس، کبوتر کہانی اور راز بہت اچھی کہانیاں تھیں۔

(ہارون الرشید، جہلم)

اس بار بھی تعلیم وتربیت ہنستا مسکراتا ملا۔ سرورق دیکھتے ہی دل دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا اور مفید مشغلے نہایت مفید سلسلے ہیں۔

(احسن ایاز، صوابی)

کل! ہم آپ کو "ہونہار مصور" کے لیے جو تصویریں بنا کر بھیجتے آپ جب 6 تصویروں کو انعام دیتے ہیں تو کیا آپ اس میں بھی قرعہ اندازی کرتے ہیں؟ (عبدالرحمٰن، لاہور)

☆ انعام کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی نہیں بلکہ مصوری کے معیار کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔

کیا میں سائنسی ایجادات کے عنوان پر مختلف ایجادات کے بارے میں ہر ماہ تحریر بھیج سکتا ہوں؟ (واجد علی محوکہ، ایبٹ آباد)

☆ ضرور بھیجیے۔

نظم "موسمِ بہار" بہت پسند آئی۔ کیا میں ایک سے زیادہ تحریریں بھیج سکتی ہوں؟ (وانیا خان، ہری پور ہزارہ)

☆ جی بھیج سکتی ہیں۔

آج کے دور میں "تعلیم وتربیت" بچوں کی تعلیم وتربیت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ کہانیوں میں راز نمبر ون رہی۔

(جویریہ نعیم، وجیہہ، تربیلا ڈیم)

اپریل کا شمارہ سپر ہٹ تھا۔ کہانیوں میں ہزار روپے اور کاگوڈا بہت پسند آئیں۔ (اقراء قمر، راول پنڈی)

اپریل کا شمارہ لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ (سید عبدالاحد، فیصل آباد)

مجھے تعلیم وتربیت سے اس قدر محبت ہے کہ میں نے پچھلے چار سالوں کے تعلیم وتربیت سنبھال کر رکھے ہیں۔

(احسن جاوید، بھکر)

☆ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

اپریل کا شمار بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں دادی اماں زندہ ہیں، کہانی ایک خط کی بہت اچھی لگیں۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ (مہرین منیر، لاہور)

تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر کہانی گڑیا گھر بہت پسند آئی۔ (عیشۃ الراضیہ طارق، فیصل آباد)

میں آپ کا رسالہ ایک سال سے پڑھ رہا ہوں۔ تعلیم وتربیت اب پہلے سے بہت بہتر ہوا ہے۔ آپ ایک ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں ہر مرتبہ کہانی لکھنے کے لئے عنوان دیا جائے اور پھر بہترین کہانیاں لکھنے والے تین بچوں کو انعامات دیئے جائیں اور ان کی کہانیاں بھی شائع کی جائیں۔

(مبین احمد، ساہی وال)

"تعلیم وتربیت" معیاری تحریروں کے ذریعے ہم سب کی تربیت کر رہا ہے۔ یہ رسالہ میری خامیوں کو ٹھیک کر رہا ہے۔ جس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

(حسن اظہر بٹ، راول پنڈی)

آپ کا اور ہمارا پیارا تعلیم وتربیت بہت عمدہ ہے۔ میں اسے گزشتہ 6 سال سے پڑھ رہی ہوں۔ میں نے ساتویں جماعت اچھے نمبروں سے پاس کر لی ہے۔ اور اس میں تعلیم وتربیت کا بہت اہم کردار ہے۔ (سجیلہ کرن ملک، ٹیکسلا)

☆ ساتویں جماعت میں کامیابی پر مبارک باد قبول کریں۔

اپریل کا شمارہ بہت دل چسپ تھا۔ سب کہانیاں بہت عمدہ تھیں۔ میری خواہش ہے کہ تعلیم وتربیت میں کوئی قسط وار کہانی شائع کی جائے۔ کیا آپ میری یہ خواہش پوری کرسکتے ہیں؟

(محمد شاہان ظفر، لاہور)

☆ آپ کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

درسِ قرآن وحدیث کے علاوہ شمارے میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور صحابہؓ اکرام کے حوالے سے کوئی تحریر نہیں ہوتی براہ مہربانی اس موضوع پر بھرپور توجہ دیں۔

(حافظ عمر فاروق، کراچی)

اپریل کا سرورق بہت خوب صورت تھا اس نے پورے شمارے کو چار چاند لگا دیئے۔ حمد باری تعالیٰ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ سب کہانیاں بہت زبردست اور سبق آموز تھیں۔

(کامران جمشید، روڈہ تھل)

میں نے رسالہ تعلیم وتربیت نیا نیا پڑھنا شروع کیا ہے۔ یہ مجھے اتنا پسند آیا ہے کہ میں نے اسے مستقل پڑھنے اور اس کے لئے کہانیاں تحریر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک کہانی آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ اگر یہ آپ کے معیار کے مطابق ہو تو شائع کر دیں۔

(اسماء، میاں والی)

اپریل کا شمارہ بہت عمدہ تھا۔ کہانیوں میں راز، کہانی ایک خط کی، دادی اماں زندہ ہیں، گڑیا گھر اور ہزار روپے بہت عمدہ تھیں۔ خاص طور پر انوکھا لباس پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔

(مونا لطیف، لاہور)

راز، سزا، ہزار روپے، کاگوڈا اور کہانی ایک خط کی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ نظم "اپریل فول" اور "موسم بہار" اچھی تھیں۔ چچا تیز گام کو نہ دیکھ کر دُکھ ہوا مگر اُمید ہے کہ وہ اگلے ماہ ضرور آئیں گے۔

(محمد ثوبان، فیصل آباد)

اس دفعہ یوں تو ساری کہانیاں زبردست تھیں، لیکن انوکھا لباس، راز اور ہزار روپے بہت اچھی تحریریں تھیں۔

(سید منظر بلال، سمندری)

ہم نے پہلی بار دماغ لڑاؤ میں حصہ لیا تھا اور ہمیں پہلی بار ہی انعام مل گیا۔ آپ کی طرف سے ارسال کردہ انعامی کتب مجھے مل چکی ہیں۔

(نبیل مہتاب، میاں والی)

اپریل کے شمارے میں کہانیاں دادی اماں زندہ ہیں، کہانی ایک خط کی اور شیر واپس آگیا بہت پسند آئیں۔

(ثانیہ طلعت، سیال کوٹ)

اپریل کا سرورق شان دار تھا۔ کہانی "گڑیا گھر" اچھی تھی۔ کاگوڈا کی تو تعریف کے لئے الفاظ ہی نہیں ہیں۔

(مشاء محمود، گوجرانوالہ)

اپریل کے شمارے میں گڑیا گھر اور دادی اماں زندہ ہیں عمدہ کہانیاں تھیں۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اپریل 2010ء کا سرورق "موسم بہار" بہار کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔

(مریم افتخار، پشاور)

مجھے نظمیں اور ملی ترانے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ کیا میں آپ کے رسالے کا حصہ بن سکتا ہوں؟

(حبیب اللہ کھوسہ، کراچی)

☆اس خط کے ذریعے آپ رسالے کا حصہ بن چکے ہیں۔

اپریل کا اداریہ بہت اچھا تھا۔ کبوتر کہانی اور سزا بہت اچھی تحریریں تھیں۔ چچا تیز گام کا شدت سے انتظار ہے۔

(ملک ارسلان علی، میاں والی)

☆ لیجئے یہ انتظار ختم ہوا، چچا تیز گام آگئے ہیں۔

اپریل کے شمارے میں حمد، درسِ قرآن وحدیث، دادی اماں زندہ ہیں، راز، سزا، کاگوڈا اور انوکھا لباس نے تو دل موہ لیا۔

اللہ کرے عمر تعلیم وتربیت اور زیادہ۔

(حسن رضا سردار، کاموںکی)

☆آمین۔

آپ مختلف سلسلوں میں انعامات حاصل کرنے والے بچوں کو جو انعامی کتب بھیجتے ہیں ان پر ادارے کی مہر لگا دیا کریں یا اپنے دستخط کر دیا کریں تاکہ دُوسروں کو پتہ چل سکے کہ یہ کتب بچوں کو انعام میں ملی ہیں۔

(زرینہ ملک، کراچی)

ایک عدالت ایسی

نذیر انبالوی (لاہور)

عمر کا دوست کامران اُسے ملنے آٹو ورکشاپ آیا تو اُس وقت اُستاد کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

"یار! تم یہاں کیوں آئے ہو اگر استاد جی آگئے تو خواہ مخواہ ناراض ہوں گے۔"

عمر کی یہ بات سن کر کامران بولا۔

"میں ایک اچھی خبر لے کر آیا ہوں۔"

"اچھی خبر....." عمر نے کامران کی بات درمیان سے اچک لی۔

"اچھی خبر یہ ہے کہ کل محنت کش بچوں کے لیے ایک خصوصی عدالت لگے گی جس میں ہمیں انصاف ملے گا اور ہمارے مالکوں کو اپنے مظالم کا حساب دینا ہوگا۔ ہم سب اس عدالت میں جائیں گے وہاں ہمیں انصاف ملے گا۔"

کامران بولتا چلا گیا۔

"انصاف..... خاک انصاف ملے گا، ہمارے ساتھ نہ کبھی انصاف ہوا ہے اور نہ ہو گا، ایسا سوچنا سراسر غلط ہے۔"

"عمر! تم مایوس کیوں ہوتے ہو، کل ہر وہ شخص کٹہرے میں کھڑا ہو گا جو ہم پر ظلم کرتا ہے، اچھا اب میں چلتا ہوں کل ہمارے سارے دوست عدالت میں جائیں گے۔"

کامران یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

دُوسرے دن بہت سے محنت کش بچے اور بچیاں عدالت میں موجود تھیں۔ ان کے معصوم چہرے یہ کہتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے کہ انہیں آج انصاف ملے گا۔ تھوڑی دیر بعد جج صاحب عدالت میں داخل ہوئے تو ایک دم خاموشی چھا گئی۔ جج صاحب کے حکم پر ملزمان کو پیش کیا گیا۔ ہوٹلوں، کارخانوں اور ورکشاپوں کے مالکان کو عدالت میں لایا گیا۔

"کارروائی شروع کی جائے۔"

جج صاحب کی آواز گونجی تو وکیل استغاثہ آگے بڑھے۔

"مائی لارڈ! آج وطنِ عزیز کے محنت کش بچے انصاف کی اُمید لگا کر آپ کی عدالت میں آئے ہیں، میں سب سے پہلے دس سالہ محسن کو پیش کروں گا۔ محسن شہر کی چونگی میں واقع ایک ہوٹل میں ملازم ہے۔ میں محسن کو پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔"

"اجازت ہے۔"

چند لمحوں بعد محسن کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اُس نے حلفاً کہا

کہ وہ جو کچھ کہے گا سچ کہے گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہے گا۔

"میں ملک صاحب کے ہوٹل میں کام کرتا ہوں۔ صبح چھ بجے ہوٹل آنے کے بعد رات دس بجے واپس گھر جاتا ہوں۔ سارا دن نہ صرف ملک صاحب کی بلکہ گاہکوں کی جلی کٹی باتیں سنتا ہوں۔ سب مجھے "اوئے چھوٹے" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ مجھے اس توہین آمیز نام سے نجات دلائی جائے۔"

محسن کے بعد عمر کٹہرے میں آیا۔

"تم کہاں کام کرتے ہو؟" وکیل نے پوچھا۔

"میں گندے نالے کے ساتھ والی آٹو ورکشاپ میں کام کرتا ہوں۔ میرے استاد جی بات بات پر گالیاں بکتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مجھے مارنے لگتے ہیں۔ پچھلے ہفتے میں صبح کے وقت گھر سے لیٹ ورکشاپ گیا تو استاد جی نے ایک گھنٹہ دھوپ میں مجھے مرغا بنائے رکھا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے استاد جی کی طرف دیکھا تو وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

"بولو..... بولو..... تم بولتے کیوں نہیں؟"

"یہ اب نہیں بولے گا کیونکہ اس کو جو رٹایا گیا تھا وہ اس نے کہہ دیا ہے۔"

وکیل صفائی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مائی لارڈ! میرے فاضل دوست مجھ پر بے بنیاد الزام لگا رہے ہیں، یہ محنت کش بچے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔ یہ محنت کش بچے اس کم عمری میں نہ صرف جبری مشقت کی چکی میں پس رہے ہیں بلکہ اپنے مالکان کے ظلم وستم بھی برداشت کر رہے ہیں۔ مائی لارڈ میں چند اور محنت کش بچوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"اجازت ہے۔" جج صاحب بولے۔

جب کٹہرے میں ایک زرد سی رنگت والا کمزور سا بچہ لایا گیا تو عدالت میں بیٹھے ہوئے لوگ سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے۔

"آرڈر..... آرڈر....."

جج صاحب نے لکڑی کا ہتھوڑا میز پر مارا۔ خاموشی ہوتے ہی کمزور بچے نے کہنا شروع کیا۔

"میرا نام جواد ہے اور میں قالین کے ایک کارخانے میں کام کرتا ہوں۔ مجھے اس کارخانے میں کام کرتے ہوئے چار سال ہونے کو آئے ہیں۔ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ کارخانے کا مالک میرے والد کو کتنے پیسے دیتا ہے۔ میرے والد مہینے کے شروع میں آتے ہیں اور پیسے لے کر چلے جاتے ہیں۔ کام کرتے کرتے میرے ہاتھوں کی انگلیاں زخمی ہو چکی ہیں۔ میں صبح کے وقت سکول جاتے ہوئے بچوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل بھر آتا ہے، کاش میں بھی ان بچوں کی طرح سکول جا سکتا۔ شاید ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

جواد کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

جواد کے بعد دس گیارہ برس کی ایک بچی نادیہ کٹہرے میں آئی تو اس کے بائیں بازو پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔

"نادیہ! تمہارے بازو کو کیا ہوا ہے؟" وکیل صاحب نے پوچھا۔

"وہ..... وہ..... دراصل....."

نادیہ کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ اسے اپنی مالکن نظر آگئی تھی۔

"ڈرو مت..... تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو بلا خوف و خطر کہہ دو، شاباش بولو تمہارے بازو کو کس طرح چوٹ لگی ہے؟"

"میں ایک کوٹھی میں کام کرتی ہوں، میری مالکن جو اس وقت سامنے والے کٹہرے میں معصوم سی صورت بنائے کھڑی ہے مجھ پر بہت ظلم کرتی ہے۔ معمولی معمولی غلطیوں پر میرا کھانا بند کر دیتی ہے۔ پرسوں اس کی نیل پالش گم ہو گئی تو اس نے نیل پالش کی چوری کا الزام مجھ پر لگا دیا۔ جب میں نے نیل پالش کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے ڈنڈے سے میری پٹائی شروع کر دی۔ ڈنڈے کی ایک ضرب میرے بازو پر اتنی شدید لگی کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی، جج صاحب آپ انصاف کریں۔"

وکیل صاحب نے اس کے بعد جوتے پالش کرنے والے،

ہمہ خشت پر کام کرنے والے، گاڑیاں صاف کرنے والے، غبارے اور اخبار بیچنے والے بچوں کو پیش کیا۔ جب سب بچے اپنے ساتھ ہونے والے مظالم بیان کر چکے تو وکیل صفائی بولے۔

"مائی لارڈ! فاضل ساتھی نے جس طرح ان بچوں کو

"اجازت ہے۔"

سب سے پہلے نادیہ کی مالکن کو صفائی کا موقع دیا گیا۔

"نادیہ کو میں نے نہیں پیٹا یہ تو بارش کے دوران لان میں پھسل گئی تھی۔ اس کے والدین نے مجھ سے روپے بٹورنے کے لئے یہ ڈرامہ رچایا ہے، میں بے گناہ ہوں۔"

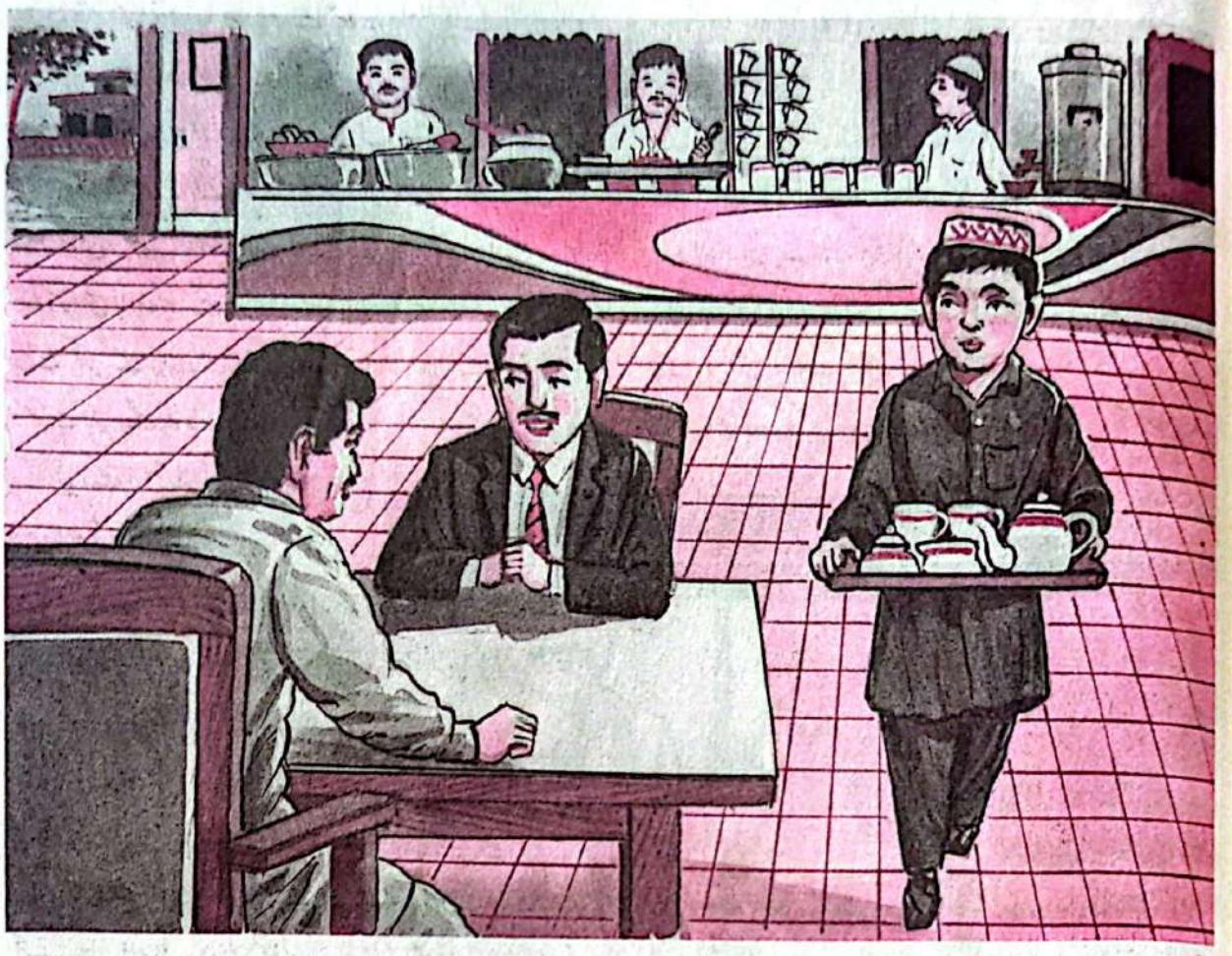

مظلوم بنا کر عدالت میں پیش کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ وکیل صاحب نے ان کو فرضی کہانیاں یاد کروانے میں خاصی محنت کی ہے۔"

"مائی لارڈ! فاضل وکیل میرے موکلین کی توہین کر رہے ہیں ان کی سچی کہانیوں کو فرضی کہانیوں کا نام دے رہے ہیں۔"

"مائی لارڈ! ان بچوں کی باتیں سن کر تو یہ محسوس ہوا ہے کہ ان کے مالکوں سے زیادہ ظالم کوئی ہستی اس دُنیا میں ہے ہی نہیں۔ میں تصویر کا دُوسرا رخ پیش کرنے کے لئے اپنے چند مؤکلین کو پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔"

"جج صاحب یہ بالکل جھوٹ ہے اسی عورت نے مجھے ڈنڈے سے مارا تھا۔ یہ ظالم ہے..... اس کو سزا دی جائے۔" نادیہ بولی۔

جواد کے باپ سے پوچھا گیا کہ وہ جواد کو کیوں تعلیم حاصل کرنے نہیں دیتا تو اس نے برجستہ جواب دیا۔

"جواد! میرا بیٹا ہے، میں اسے کام پر ڈالوں یا پڑھاؤں، یہ میری مرضی ہے۔"

"جواد تمہارا بیٹا ہے تو اس وطن کا بیٹا بھی ہے اس کی عمر کام کرنے کی نہیں بلکہ پڑھنے کی ہے۔" وکیل استغاثہ فوراً

بولے۔

وکیل صفائی نے جب ہوٹل کے مالک کو صفائی کا موقع دیا تو ملک صاحب نے محسن کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ..... یہ کام چور ہے..... جب کام نہ کرنے کی وجہ میں اسے ایک دو ہاتھ لگا دوں تو منہ بنا لیتا ہے۔ اس کو گاہک چھوٹا نہ کہیں تو بھلا اور کیا کہیں، اگر اسے یہ نام اتنا بُرا لگتا ہے تو ہوٹل میں کام کیوں کرتا ہے۔"

"اگر میرے والد زندہ ہوتے تو میں ہوٹل میں کام کرنے کے بجائے سکول پڑھنے کے لئے جاتا۔ جج صاحب میں اگر مجبوری کے باعث کام کرنے پر مجبور ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے حقیر سمجھا جائے۔ مجھے ہر گھڑی ذلیل کیا جائے۔" محسن کی آواز بھرا گئی۔

ورکشاپ کے مالک نے بھی عمر کے بارے میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا کہ وہ کام چور اور ڈھیٹ ہے۔ جب تک اِسے دو ہاتھ لگ نہ جائیں یہ کام نہیں کرتا۔

جب سب مالکان اپنی صفائی پیش کر چکے تو وکیل استغاثہ بولے۔

"مائی لارڈ! یہ محنت کش بچے آپ سے انصاف کے طالب ہیں۔ ان پر ناروا سلوک کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے تاکہ آئندہ کوئی ان پر ظلم نہ کر سکے۔"

سب محنت کش بچے بھی چلائے۔

"جج صاحب..... انصاف، انصاف کیجئے..... ہمیں انصاف چاہیے۔"

"آپ فکر نہ کریں آپ کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ عدالت فریقین کے بیانات سننے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ.....

اس سے قبل کہ جج صاحب فیصلہ سناتے ایک زور تھپڑ نے عمر کو بیدار کر دیا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔ استاد جی اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"کم بخت سوتے ہی رہتے ہو کبھی کام بھی کر لیا کرو۔"

"استاد جی کام ہی تو کر رہا تھا۔"

"زبان بند رکھو، چلو دھوپ میں مرغا بن جاؤ، چلو جلدی کرو۔"

اُستاد جی کے کہنے پر عمر دھوپ میں مرغا بن گیا۔ وہ مرغا بنے سوچ رہا تھا کہ شاید اِسے اور اِس جیسے بے شمار محنت کش بچوں کو کبھی انصاف نہیں مل سکے گا۔ ان پر یہ ظلم ہوتا رہے گا۔ اب نہ جانے کب عدالت لگے گی؟ ☆☆

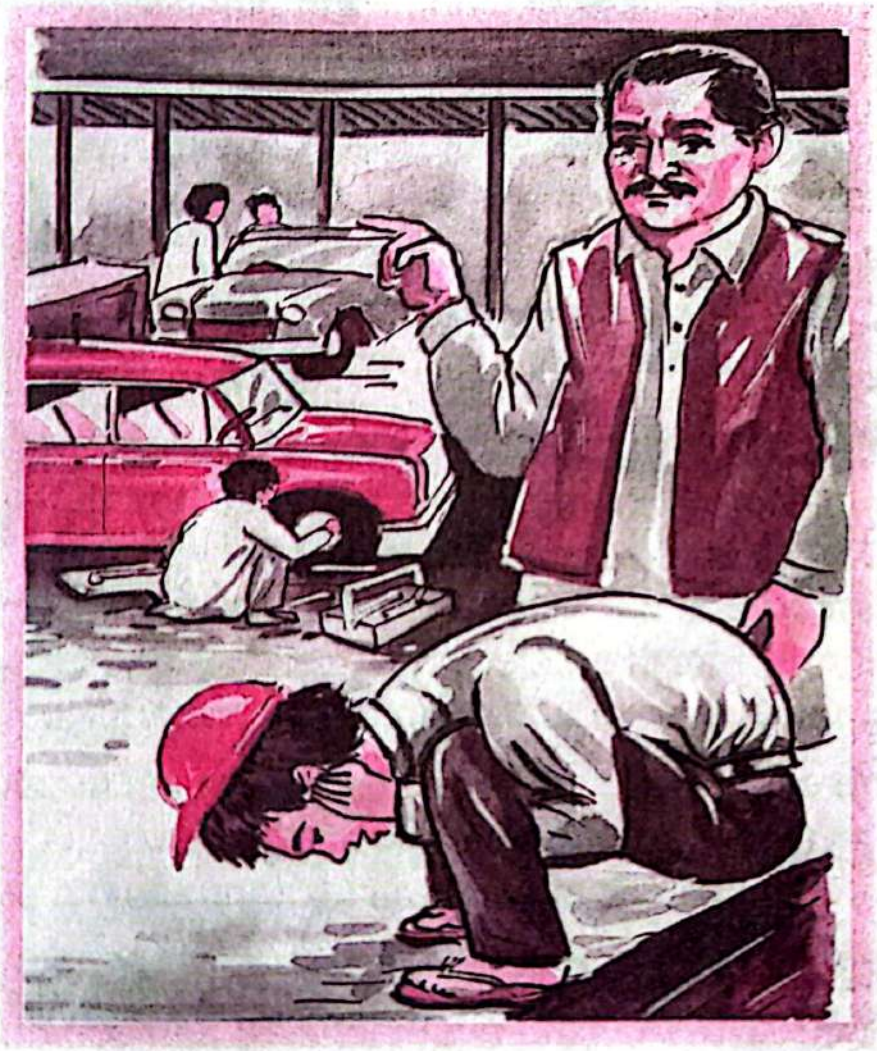

محسن

محمد فہیم عالم (لاہور)

"وہ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھیے جناب! آپ کیا بات پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"دراصل بات یہ ہے کہ....." وہ کہتے کہتے رُک گیا "نہیں..... پہلے میں اپنا تعارف تو کرا دوں۔ میرا نام امتیاز احمد ہے۔ میں آپ کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ آپ میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ میں آپ کی کتابوں کا دیوانہ ہوں۔ جب بھی آپ کی کوئی نئی کتاب شائع ہوتی ہے تو میں فوراً خرید تا ہوں۔ جس رسالے میں بھی آپ کی کوئی تحریر نظر آتی ہے۔ اُسے بھی میں فوراً خرید لیتا ہوں۔ اور یہ حال میرا ہی نہیں آپ کو پڑھنے والے ہر قاری کا ہے۔ کیوں کہ آپ کا انداز تحریر زبردست ہے۔ آپ کی تحریروں میں ایک درد ہوتا ہے کہ پڑھنے والا کھو کر رہ جاتا ہے۔ ملک میں شائع ہونے والے ہر رسالے کی خواہش ہوتی ہے کہ آپ ان کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں۔" وہ روانی کے عالم میں بولتا چلا گیا۔

"آپ کا بہت..... بہت شکریہ کہ آپ میری تحریروں کو اس حد تک پسند کرتے ہیں۔ یہ آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ مجھے ابھی لکھنا نہیں آتا اور جو لکھنے کا حق ہے میں وہ ادا نہیں کر پاتا۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مجھے جو صلاحیت دے رکھی اس کو بروے کار لا کر بھرپور کوشش کرتا ہوں کہ اچھا لکھ سکوں اور یہ سب اللہ کی مہربانی سے ہوتا ہے میرا اس میں کوئی کمال نہیں۔" اس کی بات سن کر حامد سر دھنی بولے۔

"اب پوچھیے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں! تو جناب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماشاء اللہ ہر ماہ آپ کی کوئی نہ کوئی کتاب شائع ہوتی ہے۔ اس کا معاوضہ بھی آپ کو ملتا ہو گا۔ رسائل بھی بھاری معاوضہ دے کر آپ سے تحریریں لکھواتے ہیں۔ ویسے بھی آپ کافی امیر آدمی ہیں۔ شہر کے پوش علاقے میں آپ کا بنگلہ ہے۔ آپ کے پاس اپنی گاڑی ہے۔ اس کے باوجود آپ کیوں روزانہ شام کو قاسم روڈ پر واقع ایک پرانی کتابوں کی دُکان پر ملازمت کرتے ہیں جس کے مالک ایک بابا جی ہیں۔ آپ روزانہ وہاں جا کر دُکان میں جھاڑو دیتے ہیں۔ کتابوں پر پڑی گرد کو صاف کرتے ہیں، کتابوں کو صاف کرتے ہوئے آپ کا چہرہ بھی گرد آلود ہو جاتا ہے، لیکن آپ سب سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ آپ دُکان کے مالک بابا جی کے پاؤں دباتے ہیں۔ کبھی کبھی تو انہیں قریبی ہوٹل سے چائے بھی لا کر دیتے ہیں۔ آخر آپ یہ سب کیوں کرتے ہیں؟ اگر آپ کو ان بابا جی سے ہمدردی بھی ہو تو آپ کافی امیر آدمی ہیں آپ وہاں کوئی ملازم بھی رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور یہ سب باتیں مجھے اس لیے معلوم ہیں کہ میرا گھر قاسم روڈ کے قریب ہے۔

میں نے خود آپ کو کئی مرتبہ دیکھا ہے۔" وہ اپنی بات کہہ چکا تو حامد سروہی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

"آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔"

"کہانی..... کیسی..... کہانی۔" امتیاز احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ ایک بچے کی کہانی ہے۔ اس بچے کو مطالعے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ کتابوں کا رسیا تھا۔ اس کے سکول کے ساتھی اسے کتابی کیڑا کہتے تھے۔ اسے جہاں بھی کوئی کتاب ملتی وہ اسے پڑھنے بیٹھ جاتا کیونکہ اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا اس لیے مہنگی مہنگی کتابیں اس کی دسترس میں نہ تھیں۔ اس لیے وہ گھر سے ملنے والا جیب خرچ جمع کرتا۔ لیکن مہینے بھر کی جمع پونجی سے وہ ایک کتاب ہی خرید پاتا تھا۔

اس کے محلے میں کتابوں کی ایک دُکان تھی۔ وہ روزانہ اُدھر سے گزرتے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان کتابوں کو دیکھتا کیونکہ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کو خرید نہ سکتا تھا۔ ایک دن اس کے دل میں خیال آیا کیوں نہ وہ اس دُکان میں ملازمت اختیار کرلے۔

اس طرح اس کے لیے کتابوں کا حصول آسان ہو جائے گا۔ اس نے دُکان کے مالک سے بات کی۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"نہیں بھئی نہیں، مجھے ملازم کی ضرورت نہیں۔ میری چھوٹی سی دُکان ہے۔ میرا کوئی اتنا بڑا کام نہیں ہے کہ ملازم کی ضرورت پڑے۔"

"دیکھئے..... جناب..... آپ غلط سمجھے۔ ملازمت سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں آپ سے تنخواہ لوں گا۔ میں تو صرف اس لیے آپ کی دُکان پر ملازم ہونا چاہتا ہوں کہ مجھے مطالعے کا بے حد شوق ہے، لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں اپنا شوق پورا کر سکوں۔ میں سکول سے آنے کے بعد شام کو آپ کے پاس آجایا کروں گا۔ دُکان کی صفائی اور دُوسرے کاموں میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس کے بدلے میں آپ صرف ایک کتاب مجھے روزانہ پڑھنے کے لیے دے دیا کریں۔ میں دُوسرے دن آپ کو وہ کتاب واپس کر دیا کروں گا۔" اس کے لہجے میں ایک درد تھا۔ التجا تھی۔ چنانچہ دُکان دار نے اُسے اپنی دُکان پر ملازم رکھ لیا۔ وہ روزانہ شام کو دُکان پر آتا۔ دُکان کی صفائی کرتا اور دُکان کے کاموں میں دُکان دار کا ہاتھ بٹاتا۔ وہ شام کو گھر جاتے ہوئے ایک کتاب لے جاتا۔ اس طرح اس بچے نے اس دُکان کی بہت سی کتابیں پڑھ لیں۔ پھر ایک دن اس بچے کو لکھنے کا شوق ہوا۔ اس نے ایک کہانی لکھی اور ایک رسالے کو بھیج دی جو اگلے ماہ ہی شائع ہو گئی۔

اپنی پہلی تحریر کی اشاعت پر وہ پھولا نہ سمایا۔ اُس نے دُوسری کہانی لکھی وہ بھی شائع ہو گئی..... پھر تو کہانیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تحریریں پسند کی جانے لگیں۔ ہر کہانی کی اشاعت پر دُکان دار اس بچے کی حوصلہ افزائی کرتا اور اسے چھوٹا موٹا انعام بھی دے دیتا۔ آہستہ آہستہ اس بچے کی تحریروں کی مقبولیت کا گراف بڑھتا گیا یہاں تک کہ اس کا نام ادبی حلقوں میں ایک ادیب کی حیثیت سے لیا جانے لگا۔" حامد سروہی سانس لینے کیلئے رُکے تو امتیاز احمد نے پوچھا۔

"وہ بچہ کون تھا؟"

"وہ بچہ میں تھا....."

"کیا!....." امتیاز احمد حیرت سے چلا اٹھا۔

"جی ہاں..... وہ بچہ میں تھا..... آج میں جو کچھ بھی ہوں۔ اُس بوڑھے دُکان دار کی وجہ سے ہوں۔ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں ان کا ہاتھ ہے۔ اس لیے میں اب بھی روزانہ ان کے پاس جاتا ہوں اور دُکان کے کاموں میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ شام کو واپس آتے ہوئے ان سے ایک کتاب لے کر آتا ہوں۔ اور مجھے یہ سب کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔" اتنا کہہ کر حامد سروہی خاموش ہو گئے۔

امتیاز احمد حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ احسان فراموشی کے اس دور میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے محسن کو اس طرح یاد رکھتے ہیں۔

---☆☆---

چچا تیز گام شادی میں گئے

ذیشان قریشی (لاہور)

"بیگم! ہمارے کپڑے تیار کردو۔"

چچا تیز گام نے ایک شادی کارڈ لہراتے ہوئے کہا۔

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" بیگم نے پوچھا۔

"ایک شادی میں لاہور جارہا ہوں۔"

"لاہور میں شادی۔"

"ہاں بیگم، میں لاہور شادی میں جارہا ہوں۔"

"شادی کس کی ہے؟"

"ضیاء اللہ صاحب کے برخوردار کی شادی خانہ آبادی ہے۔" چچا تیز گام نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

"ضیاء اللہ صاحب کے برخوردار کی شادی، یہ ضیاء اللہ صاحب کون ہیں؟"

بیگم کی بات سن کر چچا تیز گام نے کہا۔

"میں ان کے بارے میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں۔ یہ پہلے کراچی میں ہمارے ہمسائے تھے، اب چند سالوں سے ملازمت کے سلسلہ میں لاہور چلے گئے ہیں۔"

"چند سال پہلے، ہماری شادی کو بیس برس ہو چکے ہیں، ضیاء اللہ صاحب اس سے قبل آپ کے ہمسائے ہوں گے، آپ کہتے ہیں کہ چند سال پہلے کی بات ہے۔"

"بیگم بحث مت کرو بس میرے جانے کی تیاری کرو۔"

"کیا آپ لاہور اکیلے جائیں گے؟"

"کیا میں اکیلا لاہور نہیں جا سکتا؟ میں بچہ تو نہیں ہوں کہ اکیلا لاہور نہ جا سکوں۔"

"میرا کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"تو پھر تمہارا کہنے کا کیا مطلب تھا؟" چچا تیز گام بولتے چلے گئے۔

"میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا لمبا سفر ہے آپ اکیلے بور جائیں گے، کسی کو ساتھ لے جائیے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا، میں اصول کا بندہ ہوں، کارڈ پر صرف ایک آدمی کا لکھا ہے، اس لئے شادی میں بھی ایک آدمی ہی جائے گا، اور اُس آدمی کا نام ہے چچا تت۔ تت۔۔۔ میرا مطلب ہے تنویر احمد صاحب جائیں گے، ہمارے جانے کی تیاری کی جائے۔"

چچا تیز گام نے بادشاہوں کے انداز میں حکم دیا۔

چچا تیز گام ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ قد درمیانہ، جسم پتلا، ناک ستواں، چہرہ لمبوترا، چھوٹی چھوٹی داڑھی اور توند نکلی ہوئی تھی۔ ان کا شجرۂ نسب ایک نواب سے ملتا تھا اس لئے نئے

زمانے میں بھی ہر وقت شیروانی، پاجامہ اور پاؤں میں سلیم شاہی جوتا پہنے رکھتے تھے۔ ہال سے بے نیاز اپنے سر کو چھپانے کے لئے ایک سرخ رنگ کی پھندنے والی ٹوپی ہر وقت سر پر اور آنکھوں پر گول شیشوں والی عینک لگائے رکھتے تھے۔ نام تو ان کا تنویر احمد تھا مگر ہر کام میں تیزی کرنے کی وجہ سے چچا تیز گام کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

چچا تیز گام کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ آباؤ اجداد کی نشانیوں کے طور پر دو نوکر جمن اور استاد گھر میں پائے جاتے تھے۔ دونوں بہت باتونی اور کام چور تھے۔ چچا تیز گام ان کو اس لئے برداشت کر رہے تھے کہ دونوں صرف روٹی کپڑا کے عوض ان کے ہاں کام کر رہے تھے۔ چچا تیز گام کسی زمانے میں کاروبار کیا کرتے تھے مگر جیسے ہی والد کی آنکھیں بند ہوئیں کاروبار بھی بند ہو گیا۔ والد نے بھلے وقتوں میں تین مکان کرائے پر اٹھا رکھے تھے جس سے ہر ماہ جو پیسے ملتے تھے اُن سے گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ چند برس قبل چچا کو اپنے ننھیال کی طرف سے کچھ زرعی زمین حصے میں ملی تھی جس سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

چچا تیز گام کے دماغ پر جس کام کے کرنے کا بھوت سوار ہو جاتا تھا بس پھر وہ اُس کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ ضیاء اللہ کے بیٹے کی شادی کا کارڈ ملنے کی دیر تھی کہ چچا تیز گام زور و شور سے شادی میں جانے کے لئے تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ شام کے وقت وہ اپنے تمام کپڑے اور جوتے چارپائی پر ڈھیر کیے بیٹھے تھے۔ اچکن اور پاجاموں کے رنگ بہت شوخ تھے۔ ایک ایک اچکن کو آئینے کے سامنے جا کر جسم کے ساتھ لگا کر دیکھتے تھے اور خود کلامی کرتے ہوئے کہتے۔

"نہیں، یہ اچکن ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

جب وہ سبھی اچکنوں کو دیکھ چکے تو سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ شادی میں جانے کے لئے ان کے پاس کوئی اچھی اچکن نہ تھی۔ کچھ سوچ کر انہوں نے ہانک لگائی۔

"جمن او جمن ذرا بھاگ کر میرے پاس آؤ۔"

وہ جمن ہی کیا جو ایک دفعہ بلانے پر آجائے۔

"ابے جمن کہاں مر گئے تھا، ذرا میرے پاس آؤ۔"

"جی..... جی..... جی چچا..... کیا حکم ہے؟" جمن نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"جاؤ دیکھ کر آؤ شیدی ٹیلر ماسٹر کی دُکان کھلی ہے یا نہیں۔"

"سرکار میں یوں گیا اور یوں آیا۔"

یہ کہہ کر جمن باہر جانے ہی لگا تھا کہ چچا تیز گام نے کہا۔

"سرکار کے بچے، پوری بات تو سن لو۔"

"جی فرمایئے سرکار۔"

"شیدی ٹیلر ماسٹر سے پوچھ کر آؤ کہ کیا وہ پرسوں تک ہماری اچکن کی سلائی کر دیں گے، دیر مت لگانا، جلدی سے آنا۔"

"واہ چچا واہ..... کیا خوب فرمایا ہے، دیر مت لگانا، جلدی سے آنا..... واہ چچا واہ۔"

جمن واہ واہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ وہ راستے بھر یہ دہراتا رہا۔

"دیر مت لگانا، جلدی سے آنا، دیر مت لگانا، جلدی سے آنا۔"

بشیر کے ہوٹل کے پاس جمن کا ایک دوست اُسے مل گیا۔ وہ اپنے دوست سے باتوں میں ایسا لگا کہ اُسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ چچا تیز گام نے شیدی ٹیلر ماسٹر کی دُکان دیکھنے اور جمن کی تلاش کے لئے پھر استاد کو بھیجا۔ بشیر کے ہوٹل کے پاس جمن اپنے دوست کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ استاد کو دیکھ کر اُسے فوراً یاد آگیا کہ وہ کس کام سے آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں شیدی ٹیلر ماسٹر کے سامنے کھڑے تھے۔

"ماسٹر جی!" جمن نے اتنا کہا تو شیدی نے دونوں کی طرف دیکھا۔

"بولو کیا بات ہے؟"

"وہ چچا نے پوچھا کہ آپ پرسوں تک ان کی اچکن کی سلائی کر دیں گے؟"

"اگر چچا دو سو روپیہ زیادہ سلائی دیں گے تو میں سلائی کر

دوں گا۔"

جمن اور استاد جب گھر پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ چچا تیز گام غصے سے بھرے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ جمن اور استاد کو دیکھ کر اُن کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

"تم لوگ کہاں مر گئے تھے؟"

"اگر ہم لوگ مر گئے ہوتے تو یہاں کیسے آتے؟"

"بکو مت، تم دونوں کو جس کام کے لئے بھیجا تھا اُس کا کیا ہوا؟"

"آپ کا کام بن گیا ہے، شیدی ماسٹر کا کہنا ہے کہ دو سو روپے زیادہ سلائی دینے کی صورت میں وہ اچکن کی سلائی کر دیں گے۔"

"اس وقت پیسے کا نہیں ہماری عزت کا سوال ہے، تنویر احمد ولد امیر احمد شادی میں جائیں اور پرانی اچکن پہن کر جائیں، ایسا ہو ہی نہیں سکتا، اگر اس وقت ہمیں دو ہزار روپے زیادہ دے کر بھی اچکن سلوانا پڑتی تو یہ سودا مہنگا نہ ہوتا۔ میں اپنے پیارے دوست ضیاء اللہ کے صاحب زادے کی شادی میں نئی اچکن پہن کر جاؤں گا۔"

چچا تیز گام جوشیلے انداز میں بولتے چلے گئے۔

دو دنوں بعد جب اچکن تیار ہو کر آئی تو چچا تیز گام نے پہن کر اُسے دیکھا۔ اچکن انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اُن کی بیگم نے دیگر سامان بھی تیار کر دیا تھا۔ شام کے وقت انہوں نے دس تاریخ کی ریل کی سیٹ بھی بک کروالی۔ چچا کی تیاری مکمل تھی۔

"مجھے تو گھبراہٹ ہو رہی ہے کہ آپ اتنی دُور اکیلے جا رہے ہیں۔" بیگم نے کہا۔

"بیگم! گھبراؤ مت کچھ نہیں ہوگا۔" چچا نے فوراً کہا۔

"میں اس لیے گھبرا رہی ہوں کہ ان دنوں حالات ٹھیک جو نہیں ہیں، میں فون کر کے آپ کی خیریت دریافت کرتی رہوں گی۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے۔"

دس تاریخ کو شام چھ بجے ٹرین نے لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا۔ چچا تیز گام نے بڑا سا اٹیچی کیس سر پر رکھا اور سفری بیگ کندھے پر ڈالا تو اُن کی آٹھ سالہ بیٹی عروج نے کہا۔

"ابا! آپ میرے لیے لاہور سے کیا لائیں گے؟"

"بٹیا! جو کہو گی میں لے آؤں گا۔"

"ابا! میرے لئے پیاری سی گڑیا لائیے گا۔" عروج بولی۔

"ٹھیک ہے، لاہور کے انار کلی بازار سے اپنی بیٹی کے لیے پیاری سی گڑیا لاؤں گا۔"

"ابا! میرے لیے بھی کچھ ضرور لے کر آیئے گا۔" دس سالہ محمود نے کہا۔

"ہاں..... ہاں تمہارے لیے بھی ضرور کچھ لاؤں گا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے، اچھا اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" سب گھر والوں نے چچا تیز گام کو گھر سے رخصت کیا۔

چچا تیز گام جب اسٹیشن پہنچے تو لاہور جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر نمبر 3 پر موجود تھی۔ چچا نے گھر سے نکلتے ہوئے ٹکٹ بیگ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ جب وہ اسٹیشن پہنچے تو ٹکٹ کی تلاش شروع ہوئی۔ انہوں نے اچکن کی دونوں جیبوں کو چیک کیا۔

"یہ ٹکٹ کہاں چلا گیا؟"

"کیا آپ کا ٹکٹ چلتا بھی ہے؟" چچا تیز گام کی بات سن کر قریب کھڑے ایک شخص نے لقمہ دیا۔ چچا نے اُس شخص کو گھورا۔ مسافر دھکم پیل کرتے ہوئے ٹرین کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"میاں تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟" ایک بزرگ نے چچا کو مخاطب کیا۔

"بڑے میاں! وہ ٹکٹ۔"

"کیا ٹکٹ لیے بغیر آگئے ہو، جاؤ جلدی سے ٹکٹ لے آؤ۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"میرا ٹکٹ مل نہیں رہا، کہاں گیا میرا ٹکٹ۔"

چچا تیز گام نے یہ کہہ کر اٹیچی کیس سر سے اٹھا کر نیچے رکھا اور بیگ کو اس کے اُوپر رکھ دیا۔ اسی اثناء میں چچا کا موبائل فون بجنے لگا۔ چچا نے موبائل جیب سے نکال کر نمبر کو غور سے دیکھا اور پھر موبائل کو کان سے لگا کر اتنی بلند آواز میں "ہیلو" کہا کہ پاس کھڑے ہوئے لوگ حیرت سے انہیں تکنے لگے۔

"آپ خیریت سے اسٹیشن پہنچ گئے ہیں؟"

"بیگم اسٹیشن تو خیریت سے پہنچ گیا ہوں مگر....."

"مگر کیا؟"

"مگر ٹرین کا ٹکٹ نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے؟"

"میرے سامنے تو آپ نے ٹکٹ بیگ کی جیب میں رکھا تھا۔"

"ہاں بیگم یاد آیا ٹکٹ تو میں نے بیگ کی جیب میں رکھا تھا۔ تمہارا فون کرنا تو میرے لیے رحمت ثابت ہوا ہے، اچھا اللہ حافظ۔" یہ کہہ کر چچا تیز گام نے فون بند کر دیا۔

بیگ کی جیب سے ٹکٹ لے کر چچا تیزی سے ٹرین کی طرف بڑھے۔ اب انہیں بوگی نمبر 8 میں سیٹ نمبر 25 کی تلاش تھی۔ سر پر اٹیچی کیس اور کندھے پر بیگ رکھے وہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ آخر وہ بوگی نمبر 8 میں داخل ہوئے۔ اپنی سیٹ کا نمبر دیکھتے ہوئے وہ ایک آدمی سے ٹکرائے تو اُس آدمی نے غصیلے انداز میں کہا۔

"اندھے ہو، کیا دکھائی نہیں دیتا؟"

"معاف کرنا بھائی، ذرا یہ تو بتایئے سیٹ نمبر 25 کہاں ہے؟"

"سیٹ نمبر 25 جہاں ہے وہ وہیں ہے۔"

"پر وہ ہے کہاں؟"

"مجھے کیا پتا، جاؤ میرا سر مت کھاؤ۔"

"بھائی صاحب! وہ سامنے والی سیٹ کا نمبر 25 ہے۔" ایک گنجے سر والے آدمی نے چچا تیز گام کو مخاطب کیا۔

سیٹ نمبر 25 دیکھ کر چچا خوش ہو گئے تھے۔ سر سے اٹیچی کیس اتارنے کی کوشش میں وہ کھڑکی سے ٹکرا گئے۔ ایک لڑکے نے انہیں سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ چکرا کر گر جاتے۔

"شکریہ برخوردار شکریہ۔"

چچا اٹیچی کیس اور بیگ ایک طرف رکھ کر اپنی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ شام 6 بجے کے قریب ٹرین لاہور کے لئے روانہ ہوئی۔ سورج غروب ہوتے ہی ڈبے میں چھوٹے چھوٹے برقی قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ رات کے وقت چچا نے بیگم کے ہاتھ کی بنی ہوئی بریانی سے ڈنر کیا۔ کھانا کھانے کے بعد چچا کو نیند نہ آئے یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ جب نیند نے چچا کو زیادہ تنگ کیا تو وہ برتھ پر جا کر سو گئے۔ وہ کچھ ہی دیر میں خراٹے بھرنے لگے۔ وہ خراٹے بھر بھر کر نیند کے مزے لوٹتے رہے مگر ان کے خراٹوں سے دُوسرے لوگ رات بھر جاگتے رہے۔ کچھ مسافروں نے چچا کے خراٹوں سے تنگ آ کر انہیں جگانے کی بھی ناکام کوشش کی۔ صبح کے وقت چچا کی آنکھ کھلی تو سب لوگوں نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"ہم سے کیا قصور ہو گیا ہے، آپ لوگ کیوں ہمیں اس طرح گھور رہے ہیں؟"

"آپ کی خاصی عمر ہو گئی ہے لیکن ابھی تک آپ کو سونے کا ڈھنگ نہیں آیا۔"

"میرے سونے میں بھلا کیا خرابی ہے، میں دُوسرے لوگوں کی طرح تو سوتا ہوں۔" چچا تیز گام نے اپنا دفاع کیا۔

"لو بھائیو! سنو یہ دُوسرے لوگوں کی طرح سوتے ہیں،

میں نے زندگی بھر ایسے زور دار خراٹے نہیں سنے، توبہ توبہ خراٹے کیا تھے دھماکے تھے دھماکے۔" کونے میں بیٹھے ایک پہلوان نے کہا۔

"میاں توبہ کرو ہم اور خراٹے، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"ایسا رات بھر ہو چکا ہے۔" ایک آدمی نے فوراً کہا۔

وہ چچا تیز گام ہی کیا جو ہار مان لیں۔ جب بحث زیادہ طول پکڑ گئی تو پہلوان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"آپ سچے ہیں جب کہ ہم سب جھوٹے ہیں، آپ کے خوف ناک خراٹوں کی بازگشت ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"

اتنی دیر میں چچا تیز گام کے فون کی گھنٹی گونجی۔ چچا نے بٹن دبا کر ہیلو کہا تو دُوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"محمود کے ابا کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ خراٹے، میرا مطلب ہے خراٹوں پر گرما گرما بحث جاری ہے۔"

"اس کا مطلب ہے مسافروں نے بھی آپ کے خراٹوں کی آواز سن لی ہے۔"

"بیگم بس بھی کرو۔"

چچا ہلکی سی آواز میں بول رہے تھے مگر اُس وقت تک تمام مسافر بیگم اور ان کے درمیان ہونے والی ساری باتیں سن چکے تھے۔ اب چچا تیز گام کے پاس سوائے خاموشی اختیار کرنے کے کوئی دُوسرا راستہ نہ تھا۔ چچا کو نیند تو اس وقت بھی آ رہی تھی مگر وہ اس خوف سے نہیں سو رہے تھے کہ کہیں دوبارہ انہیں خراٹوں کی وجہ سے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

دوپہر کے وقت ٹرین لاہور پہنچی تو چچا تیز گام سر پر اٹیچی کیس اور کندھے پر بیگ ڈالے پلیٹ فارم نمبر 5 سے باہر آئے۔ سامان اٹھانے کے لیے کئی قلی ان کی طرف بڑھے مگر ہر قلی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسٹیشن سے باہر آکر ایک رکشے میں سوار ہو کر وہ برج کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔ چچا تیز گام پہلے بھی کئی بار ضیاء اللہ کے گھر آچکے تھے اس لئے انہیں گھر تلاش کرنے میں کوئی دُشواری نہیں ہوئی۔ گلی میں شادی ہونے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ چچا نے کالے رنگ کے گیٹ کے سامنے جا کر بیل پر ہاتھ رکھا تو اندر سے کسی عورت نے بلند آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں چچا تت، تت..... نہیں میں ہوں تنویر احمد، میں کراچی سے آیا ہوں۔"

چند لمحوں بعد دروازے پر ضیاء اللہ چچا تیز گام کو گلے لگا

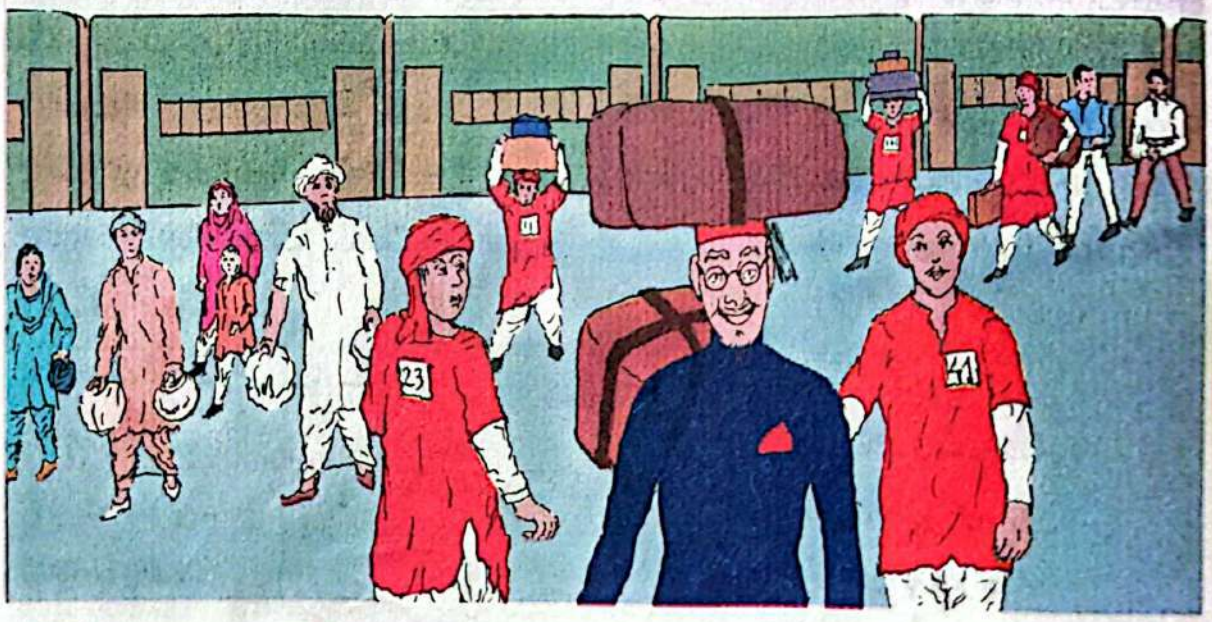

رہے تھے۔

"میرا دوست، میرا یار..... تنویر احمد..... مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ آئے ہیں۔"

"ہمارے بھتیجے کی شادی ہو اور ہم نہ آئیں۔"

چچا تیز گام یہ کہتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

"اچھا تو آپ شادی میں آئے ہیں۔" ضیاء اللہ نے چچا تیز گام کو بغور دیکھا۔

"بھئی میں شادی ہی میں آیا ہوں۔" چچا تیز گام بولے۔

"کیا آپ نے کارڈ غور سے پڑھا تھا؟" ضیاء اللہ نے پوچھا۔

"کارڈ پڑھا تو تھا مگر بہت تیزی میں پڑھا تھا، آپ بتایئے کیا کچھ غلط ہو گیا ہے؟"

"ہاں کچھ نہیں، بہت کچھ غلط ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" چچا تیز گام کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

"ثناء اللہ کی شادی اگلے ماہ کی دس تاریخ کو ہے اور آپ ایک مہینہ پہلے ہی شادی میں آگئے ہیں۔ آپ کو پہلے بھی کئی بار سمجھایا ہے کہ ہر کام توجہ سے کیا کریں مگر آپ ہیں کہ ہر کام میں تیزی دکھاتے ہیں، اگر آپ ایسا نہ کریں تو آپ کو چچا تیز گام کون کہے۔"

ضیاء اللہ کی یہ بات سن کر چچا نے پہلے شادی کارڈ اور پھر دروازے میں کھڑے بچوں کو دیکھا جو انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

☆☆

بلا عنوان کے کچھ عنوانات بغیر انعامات کے۔۔۔

☆ ہم تو چلے پردیس، ہم پردیسی ہو گئے۔ (ساجد علی، منڈی فیض آباد)

☆ جدید بچوں کی جدید فلائٹ۔ (ماریہ بنت طارق، راول پنڈی)

☆ اب تو اڑنے کا مزا آئے گا۔ (عائشہ، اوکاڑا)

☆ ہوں گے اب دُنیا کے نظارے، اِن غباروں کے سہارے۔ (وقاص شوکت، فیصل آباد)

☆ بچوں کو ملے غبارے، ہو گئے سب کے وارے نیارے۔ (عمیر اشرف، وہاڑی)

☆ مہنگائی کا توڑ، اُڑنے کے لیے ڈیزل نہ پٹرول۔ (مروہ شاہد بٹ، سیال کوٹ)

☆ واہ بھئی واہ چاند کی سیر کا مزہ تو اب آئے گا۔ (حسن رضا سردار، کامونکی)

☆ غبارے اڑائیں، خوشیاں منائیں۔ (عمارہ حسن، جویریہ حسن، راول پنڈی)

☆ اتفاق میں "طاقت" ہے۔ (امامہ عاطف، لاہور)

☆ ناچو، جھومو اور گاؤ، ہوا کے سنگ اُڑتے جاؤ۔ (فاطمہ جمیل، شیخوپورہ)

☆ ہے کوئی ہم جیسا! (محمد عمیر قمر، رحیم یار خان)

☆ مفت کے غبارے، عیش کر پیارے۔ (شہزاد علی، پاک پتن)

☆ غبارہ ایڈونچر۔ (صبا فاطمہ، جھنگ صدر)

☆ یہ ہے غبارہ جہاز۔ (سیدہ نادیہ یاسمین، کراچی)

☆ نیا دور، نیا انداز۔ (ذیشان اعجاز، گجرات)

ہونہار مصور

تعلیم و تربیت کا ٹائیٹل

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں

محمد مبین احمد، ساہی وال (پہلا انعام :175 روپے کی کتب)

سمیعہ اعظم خان، ایبٹ آباد (دوسرا انعام :150 روپے کی کتب)

اسماء احمد، لاہور (تیسرا انعام :125 روپے کی کتب)

عائشہ شیخ، راول پنڈی (چوتھا انعام :100 روپے کی کتب)

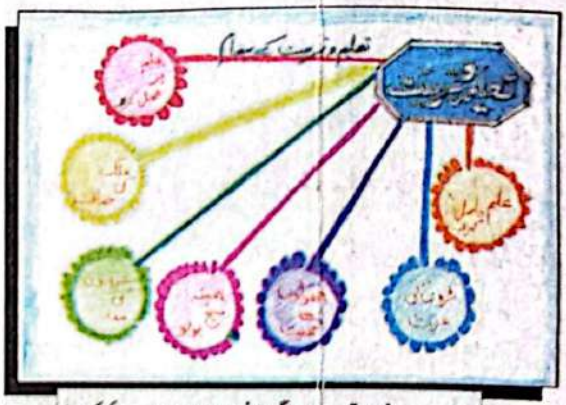

رحما سعدیہ سرفراز، قلعہ دیدار سنگھ (پانچواں انعام :90 روپے کی کتب)

لائبہ اشفاق، پشاور (چھٹا انعام :75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: عبدالرؤف ایبٹ آباد۔ نعیمہ حیدر، طیبہ عبدالرشید لسبیلہ۔ سلمی صفی ٹمن۔ عامر خان حویلیاں۔ صبورہ ناصر، طہورہ ناصر ساہی وال۔ روا رئیس لاہور۔ عاقب سلیم ملتان۔ آشا رابعہ اسلام آباد۔ ثمر ضیاء لاہور۔ شہباز حیدر جہلم۔ جویریہ منور اسلام آباد۔ انس نسیم خان کراچی۔ فاطمہ رسول اعوان لاہور۔ محمد ابراہیم لاہور۔ امیرہ فاروق اسلام آباد۔ عیشہ مریم خانیوال۔ مشہود حسین پشاور۔ لامہ جمیل خانیوال۔ روا اختر گوجرانوالہ۔ اسماء احمد لاہور۔ اقصیٰ طاہر لاہور۔ ماہ نور گوجرانوالہ۔ مجتبیٰ عارف لاہور۔ علی شہروز فیصل آباد۔ ☆☆

جون کا موضوع
طلوع آفتاب کا منظر

آخری تاریخ 8 مئی

جولائی کا موضوع
چاند اور ستارے

آخری تاریخ 8 جون

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 مئی 2010ء ہے۔

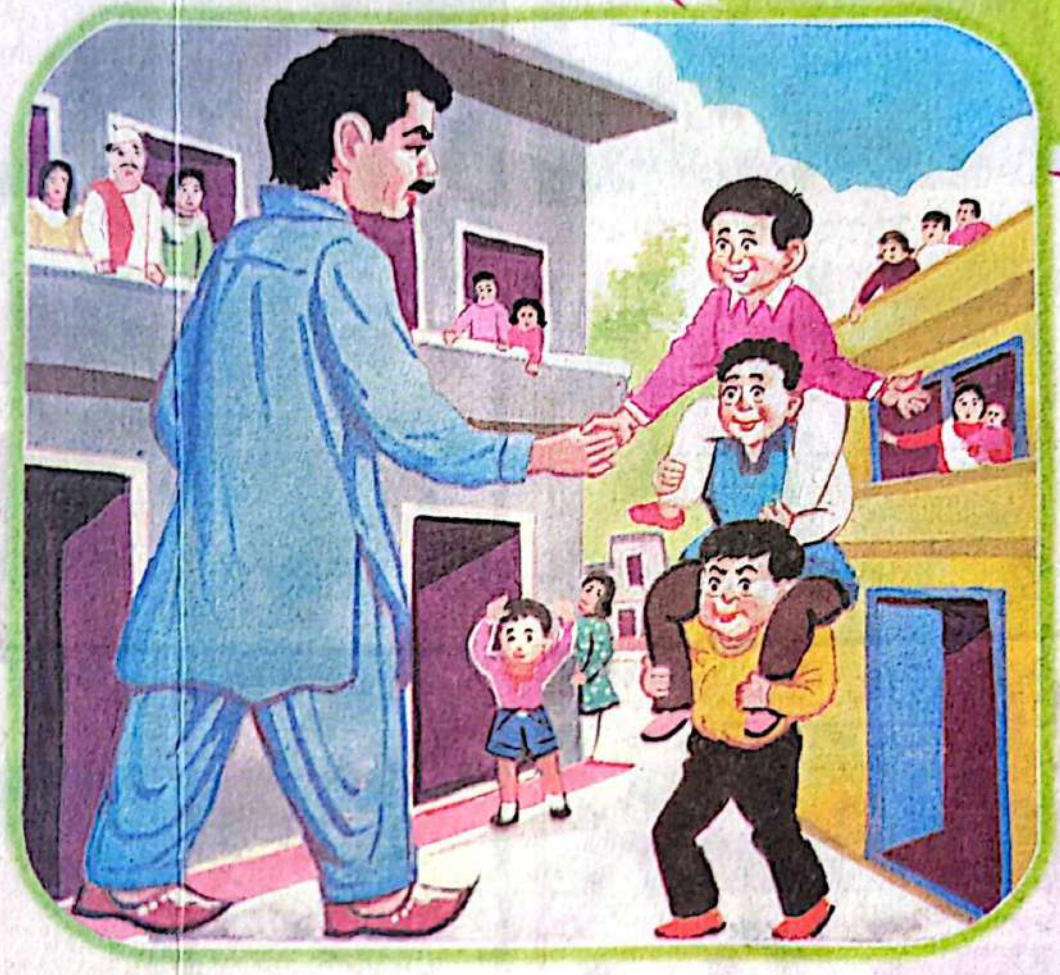

اپریل 2010ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے ہزاروں عنوانات موصول ہوئے، جن میں سے مجلسِ ادارت کو 200 عنوانات پسند آئے اور یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی کتب کے انعامات کے حق دار قرار پائے۔

☆ محمد مبشر اقبال خان، کراچی (پیراشوٹ ہو تو ایسا)
☆ محمد علی خان، لاہور (انٹرنیشنل غبارہ ڈے)
☆ شہیر احمد خان، راول پنڈی (توتائی بچاؤ، اپنے لیے، قوم کے لئے)
☆ خدیجہ نشان، کاموکی (ہوا میں لے کر اُڑے غبارے، گڈو میاں کے وارے نیارے)
☆ حافظہ سیرت فاطمہ، فیصل آباد (بلو کی اُڑان، بچے ہوئے حیران)

Serving the Nation since 116 years

Ferozsons Class-1 textbooks, approved by Govt. of Pakistan.

Rs. 66.00

Rs. 36.00

Rs. 44.00

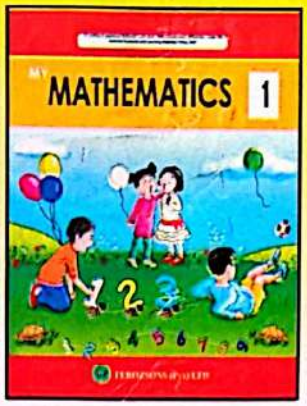

Rs. 66.00

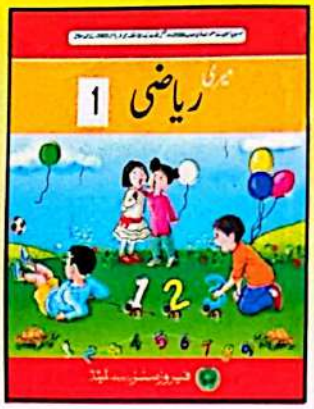

Rs. 66.00

Available at all Ferozsons bookshops, leading stockists and booksellers.

Ferozsons (Pvt.) Ltd.

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
CPL NO. 123 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES